الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کانٹے سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ
آدمی کانٹے سے نہ اُلجھے
وہ کانٹے کے مقام سے کترا کر آگے نکل جائے

جون ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۱

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۱ جون ۱۹۸۹

فہرست

قابلِ غور	صفحہ ۲	دورِ اول کی مثال	صفحہ ۱۴
سوچنے کی بات	۶	ایک سفر	۲۷
مصلحتِ دعوت	۱۱	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

قابلِ غور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بگاڑنے اور آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش آپ کے ہم عصر یہودیوں نے شروع کی جو اس وقت عرب میں آباد تھے۔ پھر صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے صدیوں تک اسے پوری قوت کے ساتھ جاری رکھا۔ موجودہ زمانہ میں ہندستان کے سلمان رشدی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ یہی نازیبا کام جدید ترین ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے انجام دے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کریں۔ وہ ایسی کتابوں کے خلاف ایجی ٹیشن اور ہنگامہ شروع کر دیں۔ اب تک مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے عملاً بس اسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور بدقسمتی سے مسلمان اپنے منفی جوش کی وجہ سے اب تک اس دوسرے پہلو سے آگاہ نہ ہو سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے کعب بن اشرف سے لے کر بیسویں صدی کے سلمان رشدی تک بے شمار لوگ مسلسل اس معاندانہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ وہ آپ کی تصویر کو داغدار کریں۔ اس مخالفانہ عمل پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ مگر ان دشمنانِ رسولؐ کو اپنے مقصد میں ایک فی صد کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ساری کوششیں عملاً کامل طور پر بے نتیجہ رہیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کی نازیبا کوششیں پچھلے پیغمبروں کے خلاف بھی کی گئیں مگر یہاں نتیجہ بالکل مختلف رہا۔ یہاں ان کے دشمنوں کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ سابق پیغمبروں کے دشمنوں نے ان کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنا یا معدوم کر دینا چاہا۔ اور عملاً بگاڑ دیا یا معدوم کر ڈالا۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر پیغمبر کے خلاف انھوں نے اپنی تحریفی کوشش کی اور ہر بار وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

انسانی تاریخ کا جو مدوّن ریکارڈ ہے، اس میں پچھلے تمام پیغمبروں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مصر کی قدیم تاریخ میں فرعون کا ذکر ہے مگر موسیٰؑ کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ فلسطین کی تاریخ سے مسیحؑ کا ذکر حذف ہے، جب کہ آپ کے ہم عصر رومی حکمرانوں کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن کے علاوہ، پچھلے پیغمبروں کی بابت جاننے کا واحد ذریعہ بائبل ہے اور بائبل کا یہ حال ہے کہ اس میں تمام پیغمبروں کو مسخ شدہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں بائبل کا بیان ہے کہ نوح کاشتکاری کرنے لگا۔ اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہوگیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا۔ (پیدائش، باب ۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ بائبل میں ملتا ہے۔ مگر اس میں آپ کی غیر متعلق خاندانی باتوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، مگر آپ کی دعوتِ توحید کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ (پیدائش، باب ۱۵)

حضرت لوط علیہ السلام ایک سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل میں ان کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو مے پلایا اور رات کے وقت ان کے ساتھ ہم آغوش ہوئیں۔ اور پھر لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ (پیدائش، باب ۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چمک قرآن کے مطابق ایک خدائی نشانی تھی۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔ (خروج، باب ۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل ان کی بابت کہتی ہے کہ سلیمان بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے کہا تھا کہ ان کے بیچ نہ جانا، کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کرلیں گی۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا۔ اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا۔ کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہوگیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کرلیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔ اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی۔ (۱۔ سلاطین، باب ۱۱)

یہ صرف چند حوالے ہیں جو بطور مثال یہاں درج کیے گئے ہیں نہ کہ بطور احاطہ۔ تفصیل کے طالب

بائبل کا مطالعہ کر کے اسے جان سکتے ہیں۔

پیغمبروں کی طویل فہرست میں اس اعتبار سے صرف ایک استثنار ہے، اور وہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تمام معلوم پیغمبروں میں آپ اکیلے پیغمبر ہیں جن کی تصویر بگاڑنے کی ہر کوشش مسلسل ناکام ہوتی چلی جارہی ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ اپنی کامل ترین ابتدائی شکل میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے اور کسی بھی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کر کے اس کو بخوبی طور پر جان سکے۔

یہ محض ایک اتفاق کی بات نہیں اور نہ یہ مسلمانوں کی کوششوں کی بنا پر ہے۔ یہ براہ راست خدا کی مداخلت کے تحت ہے۔ یہ خود خدا ہے جس نے آپ کے معاندین کی معاندانہ کوششوں کو مکمل طور پر ناکام بنا رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جن شیطانی کتابوں (Satanic books) پر انسانی حکومتوں سے پابندی لگانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ پابندی پیغمبر اسلام کے معاملہ میں، خود مالک کائنات کی طرف سے زیادہ بڑے پیمانے پر پہلے ہی سے لگی ہوئی ہے۔ امتحانی آزادی کی بنا پر خدا نے کسی دشمن حق کے زبان وقلم کو تو نہیں پکڑا۔ مگر اس کی زبان وقلم کی کاوشوں کے نتیجہ کو یقیناً پکڑ رکھا ہے۔ اس نے انہیں عملی طور پر موثر بننے سے روک دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاندین اپنی ساری کوششوں کے باوجود، باعتبار نتیجہ، پیغمبر آخر الزماں کی تصویر کو بگاڑنے کے معاملہ میں وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جو پچھلے پیغمبروں کے معاملہ میں بلا استثنار انھوں نے حاصل کر لی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبر اسلام کے دین کی اشاعت کے لیے تو کچھ نہیں کرتے، البتہ اگر کوئی معاند ایک لغو بیان دے یا ایک مخالفانہ تحریر چھاپے تو اس کے خلاف شور وغل کرنے میں وہ نہایت تیزی دکھاتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ مسلمان وہ کام کرنے کے لیے تو بہت بے قرار ہیں جس کا اہتمام خدا نے خود اپنی طرف سے کر رکھا ہے۔ مگر اس کام کو کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ موجود نہیں جو شریعت کے مطابق انہیں خود اپنی کوششوں کے ذریعہ انجام دینا ہے۔

قرآن کے مطابق مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی نصرت کریں۔ مگر نصرت سے مراد دعوت ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف شور وغل۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ پیغمبر آخر الزماں

پر طعن کرنے والوں کے خلاف شور وغل کر کے انھیں پیغمبر آخر الزماں کی نصرت کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ یہ کریڈٹ انھیں صرف اس وقت ملے گا جب کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کے پیغام کی اشاعت کے لیے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب وشرائط کے ساتھ ساری قوموں کے سامنے انجام دیں۔

مسلمانوں کی موجودہ روش کیوں ہے، اس کا نہایت گہرا نفسیاتی سبب ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان، مختلف اسباب سے، دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ ان کے بارہ میں وہ محبت اور خیر خواہی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف بھڑکنے کا موقع ہو تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری قوموں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کی بات ہو تو اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔

"رسولؐ کی شان میں گستاخی" کے مسئلہ پر اٹھنے کے لیے صرف نفرت کا جذبہ کافی ہے، جو مسلمانوں کے اندر کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے برعکس "رسولؐ کے پیغام کی اشاعت" کے لیے محبت کا جذبہ درکار ہے جو آج کے مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سوال پر تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور دوسرے سوال پر وہ حرکت میں نہیں آتے، خواہ اس کے لیے انھیں کتنا ہی زیادہ پکارا جائے۔ یہ صورت حال حد درجہ تشویشناک ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں، یہ روش یقینی طور پر خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۶۸

ہدیہ ۴۰ روپیہ

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

سوچنے کی بات

قرآن خدا کی کتاب ہے جو کائناتی حقیقتوں کو بیان کرتی ہے۔ قرآن میں جن حقیقتوں کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں سے ایک عالمگیر حقیقت وہ ہے جو ان لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے۔ فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا (پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کیساتھ آسانی ہے)

موجودہ دنیا میں جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح یہاں دشواری کے ساتھ آسانی کا پہلو بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ کبھی خوش گوار امکانات کو ختم نہ کر سکے۔ ہر ناپسندیدہ صورت حال میں دوبارہ ایک پسندیدہ موقع آدمی کے لیے باقی رہے۔ امکانات کی یہ فہرست اتنی لمبی ہے کہ اس کا سلسلہ سلمان رشدی جیسے نازیبا واقعات تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم مدینہ میں سلمان رشدی جیسا ایک بُرا کردار موجود تھا۔ یہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس ظالم نے ایک بار ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام لگایا۔ یہ جھوٹی کہانی اس طرح پھیلی کہ پورے مدینہ میں ایک مہینہ تک ہنگامی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد قرآن میں اس کی تردید اتاری گئی جو سورۃ النور (رکوع ۲) میں موجود ہے۔

ان تردیدی آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ: لا تحسبوہ شرا لکم بل ھو خیر لکم (النور ۱۱) یعنی اے مسلمانو، یہ طوفان جو تمہارے خلاف برپا کیا گیا ہے، اس کو تم اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں اچھا ہے۔ بہتان تراشی کا واقعہ بظاہر "عسر" کا ایک واقعہ تھا۔ مگر قرآن نے بتایا کہ اس میں بھی تمہارے لیے "یسر" کا یقینی پہلو چھپا ہوا ہے۔

اس یُسر (موافق پہلو) کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جب داعی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تو اس کی ذات اور اس کی دعوت لوگوں کے درمیان گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس

طرح داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان جھوٹے پروپیگنڈوں کی تردید کرکے اصل حقیقت کو واضح کرے۔ وہ اپنی بات کو ازسرِ نو مزید وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔

اس طرح ایک طرف مخالفین کا برسرِ باطل ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف داعی کا برسرِ حق ہونا اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اور زیادہ ثابت شدہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ دعوتِ حق سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ابھی تک شبہات کا شکار تھے، وہ اس کے بعد یقین کے درجہ تک پہنچ کر داعی کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھ لیتے ہیں کہ حق کا داعی ٹھوس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مخالفین کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس جھوٹے الزام اور بے بنیاد اتہام کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصل مسئلہ

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ میں قابلِ غور مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں رشدی جیسے لوگ ہیں جو اسلام کے خلاف لکھتے اور بولتے ہیں۔ بلکہ اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جس نے انہیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھیں اور بولیں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ برطانیہ میں ۱۷ویں صدی سے ایک قانون موجود ہے جو مسیحیت (اینگلیکن چرچ) کے خلاف کفریہ کلمات (Blasphemy) کو قابلِ سزا جرم قرار دیتا ہے۔ مگر اس تعزیری قانون کے ہوتے ہوئے برطانیہ میں ایک فلم بنائی گئی ہے جو سراسر اس کی منشا کے خلاف ہے۔ اس فلم کا نام ہے:

The Last Temptation of Christ

اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جنسی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ان کو اور ان کی والدۂ محترمہ (حضرت مریم) کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ یہ فلم برطانیہ میں کھلے طور پر دکھائی جا رہی ہے مگر مذکورہ قانون کے باوجود اس فلم پر آج تک پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ اس کے بنانے والوں کو کوئی سزا دی گئی۔

اب اسی ملک کی ایک برعکس مثال لیجئے۔ پیٹر رائٹ (Peter Wright) ایک انگریز ہے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ وہ برطانیہ کے محکمہ انٹلجنس میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام اسپائی کیچر (Spy Catcher) ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کے بہت سے راز بتائے گئے ہیں۔

پیٹر رائٹ نے اپنی یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کی مگر اس کی اشاعت سے پہلے حکومتِ برطانیہ کو اس کا علم ہوگیا۔ اس نے فوراً یہ کہہ کر اس پر پابندی لگادی کہ یہ کتاب سرکاری رازوں کی پردہ داری کے خلاف ہے۔ مصنف اور پبلشر کی تمام کوششوں کے باوجود یہ کتاب لندن سے چھپ نہ سکی۔ ۱۹۸۸ میں وہ ایک بیرونی ملک میں چھاپی گئی ہے۔ تاہم برطانی حدود میں اس کا داخلہ مکمل طور پر ممنوع ہے۔

اس تقابلی مثال پر غور کیجئے۔ ایک ہی ملک ہے۔ وہاں "توہین پیغمبر" کا واقعہ ہوتا ہے مگر باقاعدہ قانون کے ہوتے ہوئے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ دوسری طرف اسی ملک میں "توہین ریاست" کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت اس کے خلاف فوراً سرگرم ہوجاتی ہے اور پورا ملک اس کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کردیتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ برطانیہ توہین ریاست کی اہمیت سے واقف ہے، مگر توہین نبوت کی اہمیت کا اسے احساس نہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ان کے یہاں دونوں مثالوں میں وہ فرق پیدا کردیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ آج اسلام کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کی عظمت و اہمیت جدید لوگوں کے ذہن سے نکل گئی ہے۔ وہ اسلام کو ایک بے قیمت اور آج کے لحاظ سے بے ضرورت چیز سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جس نے لوگوں کو اسلام کے خلاف بولنے کے لیے جری کردیا ہے۔ نہ صرف غیر مسلموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو مذکورہ قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ وہ اسلام کے خلاف نہایت سطحی انداز میں لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔

اس وقت جڑ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے بارہ میں جدید انسان کی غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اسلام کی اہمیت کو آج کے انسان کے لیے دوبارہ ایک ثابت شدہ حقیقت بنایا جائے۔ اسلام کی تصویر کو لوگوں کی نظر میں اتنا باعظمت بنادیا جائے کہ کوئی آدمی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہ

کر سکے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص اس قسم کی نازیبا حرکت کرے تو اس کی بات ماحول کے اندر اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آج کوئی شخص جمہوریت (ڈیموکریسی) کے خلاف بولے تو اس کی بات موجودہ ماحول میں اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

جدید اسلامی لٹریچر

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلمان رشدی جیسے لوگ جب کوئی شر پھیلاتے ہیں تو وہ ہمارے لیے صرف شر بن کر رہ جاتا ہے، وہ ہمارے لیے خیر کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے امام اور مفکر ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کا جو تعارف پیش کر رہے ہیں، وہ صرف شور وغل ہے، اور شور وغل آج کے انسان کو صرف متنفر کر سکتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں اس کو متاثر کرنے والا نہیں۔

ایسے مواقع پر فطری طور پر اسلام کے مطالعہ کی فضا بنتی ہے۔ لوگوں کے اندر اسلام کے بارہ میں تجسس پیدا ہوتا ہے، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اسلام کو جاننے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ پاتے ہیں کہ موجودہ کتب خانوں میں ایسا لٹریچر موجود نہیں جو ان کی قابلِ فہم زبان میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو پیش کر رہا ہو۔ جس کے اندر اتنی جاذبیت ہو کہ وہ اس کو دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھ سکیں۔ آج کے انسان کے اردگرد مخالف اسلام لٹریچر کا انبار موجود ہے، مگر موثر اسلوب میں تیار کیا ہوا موافق اسلام لٹریچر کا کہیں وجود نہیں۔

راقم الحروف نے چالیس سال پہلے عصر حاضر کی اس ضرورت کا احساس کیا تھا۔ اس کے مطابق میں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا، اور اسی کے ساتھ جدید علوم کو اس کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں نے عصری تقاضوں کے تحت ایسا اسلامی لٹریچر تیار کرنا شروع کیا جو آج کے انسان کے ذہن پر اسلام کی عظمت قائم کر سکے۔ میری تمام کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے اسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کام میں اگرچہ مجھے ملت کا مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اپنی حد تک میں نے اپنی پوری طاقت اسی ایک کام میں لگا رکھی ہے۔

اسی خاص ضرورت کے تحت حال میں، میں نے ایک نئی کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے۔ "اسلام دورِ جدید کا خالق"۔ یہ کتاب ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اور عنقریب انشاء اللہ

اسلامی مرکز کے تحت چھپ کر شائع ہو جائے گی۔

اس تازہ کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ جدید سائنس اور موجودہ ترقی یافتہ دور جس پر آج کا انسان فخر کرتا ہے، وہ تمام تر اسلام کا عطیہ ہے یہ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کے ذریعہ لایا جانے والا اسلامی انقلاب ہے جس نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار وہ عمل جاری کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر دورِ جدید کی تمام ترقیاں ظہور میں آئیں۔ یہ کتاب اوّلاً انشاء اللہ اُردو زبان میں شائع کی جائے گی، اور اس کے بعد انگریزی اور دوسری زبانوں میں۔ وبیداللہ التوفیق۔

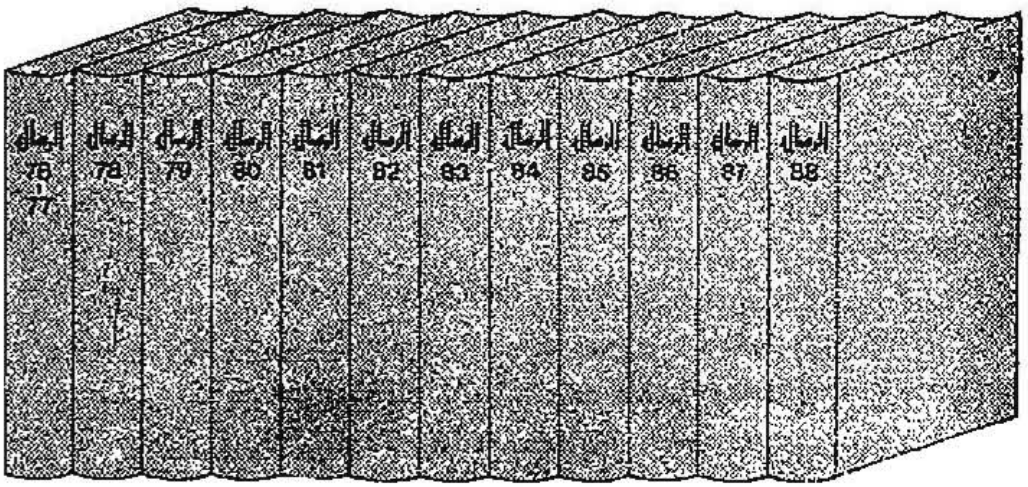

الرسالہ (مجلد)

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک، ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔ ہدیہ فی جلد ۶۰ روپیہ

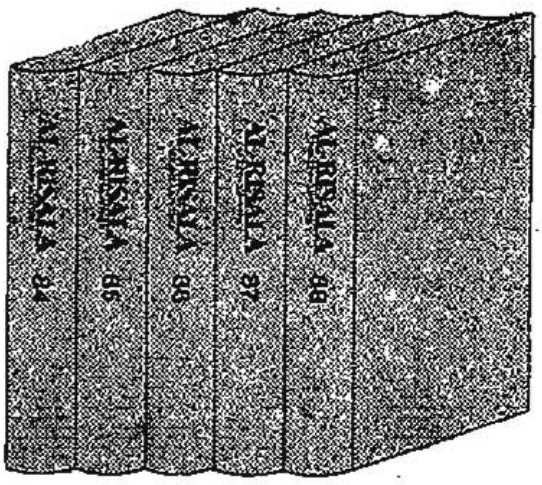

مصلحت دعوت

عبداللہ بن ابی مدینہ کا ایک منافق مسلمان تھا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت عناد تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت بے ہودہ قسم کی گستاخیاں کیں۔ آپ کی ازواجِ مطہرات کے خلاف گھناؤنے الزامات لگائے۔ حتّٰی کہ اس کا مجرم اکبر ہونا خود قرآن (النور ۱۱) میں ثبت کر دیا گیا۔

عبداللہ بن ابی کے اس مجرمانہ فعل کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اگر میں ایسا کروں تو لوگ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور آپ کی ازواج مطہرات کی کردار کشی نہایت سنگین بات ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنّت بتاتی ہے کہ ایک اور بات ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہے ـــــ لوگوں کو اسلام کی تصویر بگاڑنے کا موقع دینا۔

ایک گستاخ رسول کو سزا دینے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بہانہ بنا کر اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے، تو ایسی حالت میں اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت کو ترجیح دی جائے گی اور گستاخ رسول کی سزا کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوت اور دعوت کا مفاد ہے۔ بقیہ چیزوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

اسلام کے اس تقاضے کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کے اس شدید ردِّ عمل پر غور کیجئے جو انہوں نے سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ساری دنیا میں ظاہر کیا ہے۔ اس معاملہ میں یہ یقینی تھا اور ہے کہ سلمان رشدی کو اگر قتل کر دیا جائے، یا اس کے خلاف قتل کا "فتویٰ" جاری کیا جائے تو عالمی پریس اور غیر مسلم صحافت اس کو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لیے استعمال کرے گا۔

عبداللہ بن ابی کے قتل پر قدیم زمانہ میں اسلام کو بدنام کرنے کا جو عمل کیا جاتا اس کا اثر مدینہ یا زیادہ سے زیادہ عرب تک محدود رہتا، مگر سلمان رشدی کے معاملہ میں اس کا زبردست اندیشہ تھا کہ اس کے خلاف قتل کے فتویٰ کو لے کر سارے کرۂ ارض پر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم جاری کر دی جائے گی، جیسا کہ فی الواقع ہوئی۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں غور کرنے کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ پہلو یہی ہے مگر یہی وہ پہلو ہے جس کو موجودہ مسلم رہنماؤں نے اور ان کی پیروی میں عام مسلمانوں نے سب سے زیادہ نظر انداز کیا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں نے بلاشبہ اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی۔ رسول کے نام پر رسول کے طریقہ کی خلاف ورزی کی اس سے زیادہ سنگین مثال شاید پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

نیویارک کے ٹائم میگزین (۲۰ مارچ ۱۹۸۹ء) میں اُٹاوہ کے عبدالحسین ماجد کفائی کا خط چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب کو قابلِ مذمت کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ زیادہ بہتر تھا کہ رشدی کو زندہ رہنے دیا جائے اور تمام لوگ اس پر لعنت کریں، بمقابلہ اس کے کہ رشدی کو قتل کر دیا جائے اور پھر تمام لوگ مسلمانوں پر لعنت کریں:

It is better to let Rushdie live and be cursed by fanatical Muslims than have him killed and the Muslim world cursed by all.

راقم الحروف عبدالحسین ماجد کفائی کے اس تبصرہ سے متفق ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت میں مقامِ محمود پر فائز کیے جا چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کسی "رشدی" کی تحریریں اس کو ادنیٰ درجہ میں بھی داغدار کر سکیں۔

مگر رشدی کے خلاف مسلمانوں نے قتل کا فتویٰ دے کر جو ہنگامہ برپا کیا، اس نے اسلام کے معاندین کو اس بات کا سنہری موقع دے دیا کہ وہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں۔ وہ تمام دنیا کو یہ تاثر دیں کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے، وہ قتل و خون کا دین ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کر کے مسلمانوں نے پایا کچھ نہیں، البتہ انھوں نے ایک بہت بڑی چیز کھو دی اور جو چیز انھوں نے کھوئی وہ وہی چیز ہے جو اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے دعوتِ اسلامی کے مواقع۔

قدیم عرب میں جو "میڈیا" اہلِ کفر کے پاس تھا، وہی میڈیا اہلِ اسلام کے پاس بھی تھا۔ اس معاملہ میں دونوں برابر تھے۔ موجودہ زمانہ میں صورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ آج عالمی صحافت کا زمانہ ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک بھی ایسا اخبار یا ایسا میگزین نہیں جو عالمی سطح پر پھیلے اور تمام قوموں کے درمیان پڑھا جائے۔ دوسری طرف غیر مسلم اقوام کا حال یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر عالمی صحافت پر قابض ہیں۔ ان کے پاس ایسے اخبارات و رسائل ہیں جو کروروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

اس فرق نے بے حد نازک صورت حال پیدا کردی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی بات صرف ان کے اپنے مقامی یا گروہی پرچوں میں چھپتی ہے، وہ اس کو خود ہی چھاپتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ جبکہ فریقِ ثانی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باتوں کو اپنے عالمی پرچوں میں چھاپتا ہے اور رات دن کے اندر ان کو ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں کو نازک معاملات میں ہنگامہ آرائی کرنے سے انتہائی حد تک پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ان کی ہنگامہ آرائی کا کوئی مثبت فائدہ تو ان کو نہیں پہنچے گا، البتہ یہ منفی نقصان ہوگا کہ غیر مسلم عالمی صحافت اس کو شوشہ بنا کر ساری دنیا میں انہیں بدنام کرے گی۔ وہ بے بسی کے ساتھ اپنی اور اسلام کی بدنامی کو دیکھیں گے اور اس کے دفعیہ کے لیے کچھ نہ کرسکیں گے۔

دورِ اوّل کی مثال

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہوگیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی یا اس کا استہزار ایک ایسا جرم ہے جو علی الاطلاق طور پر مجرم کو واجب القتل بنا دیتا ہے۔ یعنی جیسے ہی کوئی شخص ایسے الفاظ بولے جو مسلمانوں کو رسول اللہ کی شان میں گستاخی نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا مطلق نظریہ شرعی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اسلام میں اس کے لیے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ استہزار کا معاملہ کوئی اتفاقی نہیں۔ یہ مجرمانہ فعل بلا استثنار خدا کے تمام پیغمبروں کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا ہے (الحجر ۱۱، الزخرف ۷) قرآن میں تقریباً ۵۰ مقامات پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کے معاصرین نے پیغمبروں کا استہزار اور تمسخر کیا۔ انھوں نے ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔ مگر ایک جگہ بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جہاں بھی کوئی شخص پیغمبر کا مذاق اڑائے، فوراً اس کو قتل کر دو۔ ایسے کسی شخص کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو۔

قرآن میں استہزار کے جرم کا ذکر تو بار بار آیا ہے مگر اس کے مجرم کے لیے سزائے قتل کا اعلان سارے قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔ قرآن میں مستہزئین رسالت کے سلسلہ میں صرف دو قسم کے ردِّ عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یا تو دلائل کے ساتھ ان کی کہی ہوئی بات کو رد کیا گیا ہے، یا انہیں خدا کی پکڑ سے اور اس کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

یہ استہزار کرنے والے غیر مسلمین بھی ہوتے تھے (یٰس ۳۰) اور منافق قسم کے مسلمان بھی (البقرہ ۱۴، التوبہ ۶۵) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ معاملہ اپنی بدترین صورت میں پیش آیا۔ مگر مجرد استہزار کی بنا پر قرآن میں نہ غیر مسلموں کے لیے قتل کی قانونی سزا کا حکم دیا گیا اور نہ منافق مسلمانوں کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر رسول کی اہانت اور آپ کے ساتھ گستاخی کو اس طرح مطلق انداز میں واجب القتل جرم قرار دے دیا جاتا تو یہ مجرم سے زیادہ خود اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان

کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ اسلام کے وہ مقدس سپاہی جن کو صحابۂ کرام کہا جاتا ہے، ان کی بیشتہ تعداد ابتداءً عین اسی جرم میں مبتلا تھی جس کو "رسول کی شان میں گستاخی" کہا جاتا ہے۔ اگر اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی فوراً انہیں قتل کر دیا جاتا تو یہ سادہ معنوں میں صرف مجرم کا قتل نہ ہوتا بلکہ تاریخ ساز انسانوں کا قتل ہوتا۔ اس کے بعد اسلام کی وہ تاریخ ہی نہ بنتی جو بعد کو بنی، اور جو موجودہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ پُرفخر سرمایہ ہے۔ تمام قیمتی زندگیاں اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں کہ وہ اسلام قبول کریں اور دنیا کی تاریخ میں وہ عظیم الشان کردار ادا کریں جو منصوبۂ الٰہی کے تحت ان کے لیے عالمی سطح پر مقدر کیا گیا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ واقعات بطور حصر نہیں ہیں، بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ پہلے کچھ غیر مسلموں کے واقعات درج کیے جائیں گے، اور اس کے بعد کچھ مسلمانوں کے واقعات۔

مستقبل پر نظر

قدیم مکہ میں جو ممتاز افراد تھے، ان میں سے ایک شخص کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ آج سہیل بن عمرو کا شمار صحابہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ وہ بدر کی لڑائی میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں رسول اللہ ؐ کے مقابلہ میں مشرکین کو شکست ہوئی۔ ان کے ۷۰ آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک سہیل بن عمرو بھی تھے۔

سہیل بن عمرو کے اندر زبان آوری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ خطیبِ قریش کہے جاتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بھرپور طور پر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ وہ شعر اور خطابت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے رہتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے اور ان کے اوپر مسلمانوں کو پوری طرح قابو حاصل ہو گیا، تو حضرت عمر فاروق رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دانت توڑ دوں۔ اس طرح اس کی زبان باہر نکل پڑے گی اور اس کی آواز خراب ہو جائے گی۔

اس کے بعد وہ اس قابل نہ رہے گا کہ آپ کے خلاف خطیب بن کر کھڑا ہو سکے۔

بظاہر یہ ایک جائز بات تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا مُثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں اس کا مُثلہ کروں تو اللہ میرا مُثلہ کرے گا، اگرچہ میں ایک رسول ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے مزید ایک بات فرمائی۔ یہ بات بظاہر شخصی ہے مگر وہ ایک عالمی انسانی حقیقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سہیل بن عمرو ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں تم ان کی مذمت نہ کر سکو۔ (انہ عسیٰ ان یقوم مقاماً لا تذمّہ) سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۹۳) چنانچہ مُثلہ یا قتل کے بغیر سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غیر معمولی سلوک کیا کہ غزوۂ بدر (۲ھ) کے بعد ان پر قابو پانے کے باوجود انہیں رہا کر دیا۔ مگر اب بھی وہ اپنی اسلام دشمنی سے باز نہ آئے۔ انھوں نے مکّہ کے لوگوں کو دوبارہ اکسایا اور تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اندوہناک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ احد (۳ھ) کہا جاتا ہے۔

یہی سہیل بن عمرو تھے جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر لفظ رسولؐ کو کاغذ سے محو کرایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی یک طرفہ شرائط پر راضی ہونے کے لیے مجبور کیا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ ۸ھ میں مکّہ فتح ہو گیا۔ اس وقت تک سہیل بن عمرو کفر کی حالت میں تھے۔ مگر اب بھی، ثابت شدہ جرائم کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے برعکس آپ نے اپنے اصحاب کو ان کے ساتھ حسن اخلاق کی ہدایت فرمائی۔ آپ نے کہا:

من لقی سهیل بن عمرو فلا یحد الیه	جو شخص سہیل بن عمرو سے ملے، وہ اس کی
النظر۔ فلعمری ان سهیلاً له عقل	طرف تیز نگاہوں سے نہ دیکھے۔ میری جان کی قسم،
وشرف وما مثل سهیل یجهل الاسلام	بلاشبہ سہیل عقل اور شرف والا آدمی ہے۔

(سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۲۲۶)

اور سہیل جیسا آدمی اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایتیں جاری رہیں۔ غزوۂ ہوازن کے بعد آپ نے ان کو ایک سو اونٹ تالیف قلب کے طور پر دیے۔ اس عطیہ کے بعد وہ بالکل ڈھ پڑے اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں یہ تاثر پھیل گیا کہ وہ شخص دُنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے اسلام کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ چنانچہ عرب قبائل کی اکثریت ارتداد کی طرف مائل ہوگئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مکہ کے بیشتر لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ انھوں نے اس کا پورا ارادہ کر لیا۔ مکہ کی فضا اتنی خراب ہوئی کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل عتّاب بن اُسید روپوش ہو گئے۔

مذکورہ سہیل بن عمرو اس وقت تک اسلامی جماعت کے ایک فرد بن چکے تھے۔ وہ شاندار خطیب ہونے کے ساتھ ایک بارعب شخصیت والے آدمی تھے۔ جب انھوں نے مکہ کا یہ حال دیکھا تو وہ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان ایک پُرزور تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس نے اسلام کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ جو شخص ہمارے خلاف کچھ کرے گا، ہم تلوار سے اس کی گردن مار دیں گے۔

سہیل بن عمرو کی گرج دار تقریر کو سن کر لوگوں نے رجوع کر لیا۔ انہوں نے اسلام سے پھرنے کا جو ارادہ کیا تھا، اس سے باز آ گئے۔ اس کے بعد عتّاب بن اسید بھی روپوشی سے نکل آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہی مطلب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں وہ تمہارے نزدیک قابلِ مذمت نہ ہوں بلکہ قابلِ تعریف ہوں۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنّت بتاتی ہے کہ آپ کی نظر حال پر نہیں رکتی تھی۔

آپ آدمی کے حال سے گذر کر اس کے مستقبل کے امکانات کو دیکھتے تھے۔ ایک انسان کا آج اگر باغیانہ ہے تو اس کو نظر انداز کر کے آپ یہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ ہمارا وفادار ہو جائے۔ اور پھر اس کی وہ خداداد صلاحیتیں جو اس وقت اسلام کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں، وہ اسلام کی تائید میں استعمال ہونے لگیں ـــــ تاریخ بتاتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔

اگلی نسلوں تک انتظار

اسلامی تاریخ میں ۱۰ نبوی کو عام الحزن کہا جاتا ہے، کیونکہ اسی سال اوّلاً ابوطالب اور اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ کے حالات انتہائی حد تک غیر موافق ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اسی سال مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ یہ سفر اس امید میں تھا کہ شاید طائف میں آپ کے لیے کام کے موافق حالات مل سکیں۔

مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ طائف کے سرداروں (عبد یالیل، مسعود، حبیب) نے آپ کے ساتھ بے حد گستاخی اور اہانت کا سلوک کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جو آپ کی ہنسی اڑائیں اور آپ پر پتھر برسائیں۔ آپ اس حال میں طائف سے واپس ہوئے کہ پتھروں کی مار سے آپ کا جسم خوں آلود ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن وہ ہے جو طائف کے سفر کے موقع پر گزرا۔

صحیح بخاری (باب ذکر الملائکۃ) میں ہے کہ جب آپ طائف سے زخم خوردہ اور غم گین حالت میں واپس لوٹ رہے تھے تو قرن ثعالب کے مقام پر حضرت جبریلؑ آپ کے پاس آئے انھوں نے آپ کو آواز دے کر کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کے سلوک کو دیکھا۔ اب اللہ نے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتہ) کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اہل طائف کے بارہ میں جو کچھ چاہتے ہیں، اس کا انہیں حکم دیں۔

اس کے بعد ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) سامنے آیا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اللہ نے آپ کے خلاف آپ کی قوم کی بات سنی۔

میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو باہم ملا کر اس کے درمیان طائف کی بستی کو پیس ڈالوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے وہ انسان پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے۔ (ارجوان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ لا یشرک بہ شیئا)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر موجودہ نسل نہ مان رہی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اگلی نسلوں تک انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔ موجودہ لوگوں کی طرف سے توہین اور سرکشی کا تجربہ ہونے کے باوجود آپ اس امید میں انھیں ہلاک کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ شاید ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد میں وہ انسان پیدا ہو جو خدا کی خدائی کا اعتراف کرے اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد کے دور میں طائف کے تمام باشندے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مثلاً ابو عبید مسعود ثقفی انہیں اہل طائف کی اولاد تھے۔ وہ اس مسلم فوج کے قائد تھے جس نے حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایران میں جہاد کیا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی فوج کے مقابلہ میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر ایرانی فوجوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ انہوں نے جنگ کا حوصلہ کھو دیا۔

محمد بن القاسم ثقفی ۷۱۱ء (۹۵ھ) میں سندھ کے راستہ سے ہندستان میں داخل ہوا۔ وہ ایک انتہائی عادل اور باصلاحیت سردار تھا۔ اس نے صرف دو سال کے عرصہ میں سندھ اور پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی کہ ایک پورا علاقہ اللہ کے دین کے سایہ میں آگیا۔ موجودہ پاکستان محمد علی جناح کی دین نہیں بلکہ حقیقتاً وہ محمد بن القاسم ثقفی کی دین ہے۔

محمد بن القاسم اتنا لائق اور شریف سردار تھا کہ جب وہ ہندوستان سے واپس ہو کر دمشق گیا تو، فتوح البلدان کے بیان کے مطابق، اہل ہند اس کے لیے روئے اور اس کا مجسمہ

بنا کر اس کی تعظیم و تقدیس کی (فبکیٰ اھل الھند وصوروہ) اسلام کا یہ قیمتی مجاہد اسی قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا جس کی بدترین گستاخی اور ایذا رسانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کے عبادت گذار بنیں گے۔

قبیلۂ ثقیف (اہل طائف) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی اور ایذا رسانی کا بدترین فعل کیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کو سزا دینے کا معاملہ پوری طرح آپ کے قابو میں تھا، کیونکہ پہاڑوں کا فرشتہ (ملک الجبال) آپ کے حکم کے نفاذ کے لیے آچکا تھا۔ مگر آپ نے انہیں سزا دینے کے بجائے اس کو پسند کیا کہ ان کی نسلوں سے ایسے افراد نکلیں جو اسلام کے سپاہی بن کر اسلام کی تاریخ بنائیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔ اگر آپ طائف والوں کی گستاخی کی سزا دینے کے لیے ملک الجبال کو استعمال کرتے تو طائف آج صرف کھنڈروں کی داستان ہوتا، نہ کہ اسلام کے قلعہ کی تعمیر کی شاندار تاریخ۔

آج کا دشمن کل کا دوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخالفین میں سب سے بڑا کردار جس شخص نے ادا کیا، وہ مکہ کا عمرو بن ہشام ہے جو تاریخ میں ابوجہل کے نام سے مشہور ہے۔ ابوجہل کے لڑکے کا نام عکرمہ تھا۔ عکرمہ آج اصحاب رسول کی معزز فہرست میں شامل ہیں، مگر فتح مکہ سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف تھے اور اس معاملہ میں پوری طرح اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ گستاخی اور جارحیت کی کوئی قسم نہ تھی جو انھوں نے آپ کے خلاف اختیار نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے باپ کی موت کے بعد بھی وہ بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سرگرم رہے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مشرک فوج کے میمنہ کے سردار خالد بن ولید تھے، اور میسرہ کے سردار عکرمہ بن ابی جہل۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عکرمہ کا جرم اتنا واضح تھا کہ فتح مکہ کے بعد وہ مکہ کو چھوڑ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔

ان کی بیوی جو مسلمان ہوگئی تھیں، وہ یمن جاکر باصرار انہیں واپس لے آئیں۔ وہ انتہائی شرمساری کے ساتھ اپنا سر جھکائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا مجھے امان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، تم کو امان ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار انھوں نے کلمہ شہادت ادا کر کے اسلام قبول کر لیا۔

عکرمہ جب یمن سے واپس ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عکرمہ تمہارے پاس آرہے ہیں۔ تم ان کے باپ (ابوجہل) کو برا نہ کہنا۔ کیونکہ مُردہ کو برا کہنا مُردہ تک تو نہیں پہنچتا، البتہ وہ زندہ کو تکلیف دیتا ہے۔ عکرمہ جب آپ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوش ہو کر ان کی طرف تیزی سے بڑھے، حتیٰ کہ آپ کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد عکرمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم طلب کرو میں تمہیں ضرور وہ چیز دوں گا۔ عکرمہ نے کہا کہ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ہر دشمنی جو میں نے آپ کے ساتھ کی ہے، یا ہر رکاوٹ جو میں نے آپ کے راستہ میں ڈالی ہے، ہر وہ لڑائی جو میں نے آپ کے خلاف لڑی ہے، ہر وہ بدکلامی جو میں نے آپ کے منہ پر کی ہے یا آپ کے پس پشت کی ہے، ان سب کو آپ معاف کر دیں اور ان کے بارے میں اللہ سے میرے لیے استغفار فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی ان کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ ہر وہ عداوت جو عکرمہ نے میرے ساتھ کی، ہر وہ سرگرمی جو انھوں نے اس ارادہ سے کی کہ تیرے نور کو بجھا دیں، ان سب کو تو ان کے لیے معاف کر دے اور وہ سب کچھ جو انھوں نے میری بے آبروئی کے لیے کیا، خواہ میرے سامنے کیا ہو، یا میرے پسِ پشت، ان سب کو تو ان سے معاف کر دے۔

اس کے بعد عکرمہ نے کہا کہ اے رسول اللہ، خدا کی قسم، ہر وہ خرچ جو میں اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کرتا تھا، اب میں اس کا دُگنا اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو جنگیں میں نے کیں، اب اللہ کے راستہ میں اس سے

دُگنا جنگ کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد عکرمہ اپنی جان اور اپنے مال کیساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں لگ گئے۔ وہ برابر اسی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ یرموک کے معرکہ میں زبردست جانبازی دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (حیاۃ الصحابہ طبع دمشق، الجزء الاول، صفحہ ۷۷۔۱۷۶)

عکرمہ نے گستاخی سے لے کر جارحیت تک ہر جرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا تھا۔ بظاہر وہ صرف اس قابل تھے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل نہیں تھے، داعی تھے۔ آپ نے عکرمہ کے "آج" میں ایک چھپا ہوا "کل" دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ داعیانہ نگاہ تھی جس کی بنا پر آپ نے انہیں یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ بعد کے واقعات نے بتایا کہ آپ کا اندازہ نہایت درست تھا۔ چنانچہ دشمن عکرمہ کے اندر سے ایک دوست عکرمہ برآمد ہوا۔ جو شخص اپنی ابتدائی زندگی میں کفر کا کھمبا بنا ہوا تھا، وہ اپنی بعد کی زندگی میں اسلام کا ستون بن گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد

اوپر ان لوگوں کی مثال نقل کی گئی ہے جو قبولِ اسلام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہوئے مگر انھیں سزا دینے کی بجائے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اب کچھ ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جب کہ آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ اس کے باوجود اس مسلمان کو قتل کی سزا نہیں دی گئی۔

۱۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ، مجھ سے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر نے مقسم بن ابو القاسم مولیٰ عبد اللہ بن الحرث بن نوفل کی روایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اور تلید بن کلاب اللیثی دونوں نکلے، یہاں تک کہ ہم عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا۔ کیا آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے جب حنین کے دن تمیمی نے آپ سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بنو تمیم کا ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس کو ذو الخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو مالِ غنیمت دے رہے تھے۔ (وہ دیکھتا رہا) یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے محمدؐ، میں نے اس کو دیکھ لیا جو آپ نے آج کیا ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے عدل کیا ہو (لم أرك عدلت)

عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے بیان کیا کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو گئے۔ آپ نے کہا کہ تیرا برا ہو، اگر میرے پاس عدل نہیں ہوگا تو پھر کس کے پاس عدل ہوگا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا میں اسے قتل نہ کر دوں۔ آپ نے کہا کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہوگی جو دین میں تعمق کرے گی، یہاں تک کہ وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کہ تیر شکار سے۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۴۴)

مذکورہ مسلمان (ذو الخویصرہ) کے معاملہ پر غور کیجئے۔ اس نے خدا کے رسولؐ کی شان میں جو گستاخی کی وہ سادہ معنوں میں صرف ایک لفظی گستاخی نہ تھی، وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت پر ضرب لگانے کے ہم معنی تھی۔ اس شخص نے آپ کی عدالت پر شبہ کیا تھا اور آپ کو اپنے خیال کے مطابق غیر عادل بتایا تھا۔ یہ بات انتہائی حد تک سنگین ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قرآن کے راوی کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بواسطہ جبریلؑ خدا کا کلام پایا ہے۔ اور اس کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی اسی روایت پر یقین کر کے ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ کسی روایت کو قبول کرنے کے لیے راوی کا عادل ہونا شرط لازم ہے۔ جس راوی کی عدالت مشتبہ ہو، اس کی روایت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسی حالت میں مذکورہ تمیمی مسلمان کا آپ کو غیر عادل بتانا گویا آپ کے راوئ قرآن ہونے کی حیثیت کو مشتبہ قرار دینا ہے۔ یہ بلاشبہہ سب سے زیادہ سخت بات ہے جو آپ کے خلاف کہی جا سکتی ہے۔ مذکورہ شخص نے اتنی سنگین بات کہی، اس کے باوجود اس کو نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ اس کو قتل کیا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ رسول اللہؐ کی شان

میں گستاخی بجائے خود مستوجب قتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے واجب القتل ہونے کے لیے اسی کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاست اسلامی سے بغاوت۔ چند افراد جو دورِ اوّل میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انہیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا نہ کہ مجرد گستاخیٔ رسول کے جرم میں۔

۲ شعبان ۶ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ بنی المصطلق کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ کے لیے جو لشکر روانہ ہوا، اس میں عبداللہ بن ابی اور دوسرے بہت سے منافق قسم کے مسلمان بھی شریک تھے۔ یہ لوگ اپنی بے حسی اور بے خوفی کی بنا پر معمولی باتوں کو شوشہ بنا لیتے اور رسول اللہ ؐ اور مخلص مسلمانوں کے خلاف فتنے برپا کرتے رہتے۔

اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ واپسی میں فوج نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہؓ حسب معمول رات کے آخری حصہ میں رفع حاجت کے لیے دور چلی گئیں۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک معمولی قسم کا ہار تھا، وہ اتفاق سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ حضرت عائشہ اس کو تلاش کرنے لگیں۔ اندھیرے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ دیر لگ گئی۔

حضرت عائشہؓ ابھی لوٹی نہیں تھیں کہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت حضرت عائشہ اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھیں جو چاروں طرف کپڑے سے ڈھکا ہوتا تھا، اور چار آدمی اس کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک چھوٹی اور دُبلی خاتون تھیں۔ چنانچہ ہودج اٹھانے والوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی سواری نہیں ہے۔ انھوں نے خالی ہودج کو اونٹ پر رکھ دیا اور اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کوئی اور صورت نہ پاکر وہ وہیں چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ صبح کے وقت صفوان بن معطل سُلمی وہاں آئے جو قافلہ کے پیچھے چلنے پر مامور تھے۔ میدان میں ایک خاتون کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ (عائشہ) ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے سوا انھوں نے کوئی اور کلام نہ کیا۔ صرف اپنا اونٹ لاکر حضرت عائشہ کے پاس

بٹھادیا۔ حضرت عائشہ اشارہ کو سمجھ کر اونٹ پر سوار ہوگئیں ۔ اس کے بعد وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئے ۔

دوپہر کے قریب یہ اونٹ مسلمانوں کے قافلہ سے جا ملا جبکہ وہ اگلے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ابن ابی مُلیکہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ جب اس طرح قافلہ میں پہنچیں تو منافقین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا جو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سردار عبد اللہ بن ابی نے پوچھا کہ یہ کون ہے ۔ لوگوں نے بتایا کہ عائشہ ہیں۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، نہ یہ اس سے بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ تمہارے پیغمبر کی بیوی نے ایک غیر شخص کے ساتھ رات گزاری، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، اب وہ ان کو لے کر آرہا ہے۔ (قال عبد الله بن ابیّ رئیسهم من هٰذه ۔ قالوا عائشة۔ قال : والله ما نجت منه وما نجا منها ۔ وقال : امرأة نبيكم باتت مع رجل حتى اصبحت ثم جاء يقودها ، (التفسير المظهري، المجلد السادس، صفحه ۴۴۷)

اس کے بعد جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے اس معاملہ کو پروپیگنڈہ کا اشو بنایا اور اس کو بھرپور طور پر آپ کے خلاف استعمال کیا۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں ہنگامی حالت پیدا ہو گئی۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا، ہر زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے۔ حضرت عائشہ کا یہ حال تھا کہ وہ رات دن روتی رہتی تھیں ۔ اس قصہ کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ ہنگامی صورتِ حال ایک مہینہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ سورہ النور کی آیتیں ۱۱۔۲۱ اُتریں ۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ عائشہ مکمل طور پر معصوم اور بے قصور ہیں ۔ اس معاملہ میں سارا جرم یک طرفہ طور پر عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے ۔ اس طرح یہ سنگین معاملہ براہِ راست خدائی مداخلت کے ذریعہ ختم ہوا ۔

عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ

مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت کے ساتھ اتنا بڑا بہتان تراشا۔ خود قرآن کی گواہی (النور، ۱۱) کے مطابق، اس معاملہ میں عبداللہ بن ابی سب سے بڑا مجرم تھا۔ قرآن میں اس کے ابلیسی جرم کا اعلان کیا گیا، مگر اس کے لیے کوئی قانونی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ اس کی سزا کے معاملہ کو تمام تر آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ کے بعد زندہ رہا، یہاں تک کہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مر کر وہ اپنا حساب دینے کے لیے خدا کے یہاں چلا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے عبداللہ بن ابی کی بابت کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (صفحہ ۷۰) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے مزید یہ فرمایا کہ ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور بہتر سلوک کریں گے، جب تک وہ ہمارے درمیان رہے (بل نترفق بہ ونحسن صحبتہ ما بقی معنا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۷۲)

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کچھ کیا، وہ آپ کی اور آپ کے اہلِ بیت کی کردار کشی کی بدترین صورت تھی۔ یہ پیغمبر کے خلاف اتنی بڑی مجرمانہ حرکت تھی کہ اس سے بڑی کسی مجرمانہ حرکت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مدینہ کے حاکم تھے۔ اس اعتبار سے آپ کو عبداللہ بن ابی کے اوپر کامل قانونی اختیار حاصل تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ صرف اس کے جرم کا اعلان کر کے اس کو آزاد چھوڑ دیا۔

ایسی حالت میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجب قتل جرم ہے، وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

ایک سفر

اگست ۱۹۸۸ کی ۲۷ تاریخ تھی۔ اور دن کے ڈیڑھ بجے کا وقت، میں اپنے دفتر میں مطالعہ میں مشغول تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کیلی فورنیا (امریکہ) سے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو وہ لوگ امریکہ میں ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اس میں شرکت کروں۔ انھوں نے کہا کہ آپ اتنا وقت نکال کر آئیں کہ کانفرنس میں شرکت کے بعد امریکہ کے دوسرے مقامات پر بھی آپ کے خطابات کا پروگرام رکھا جا سکے۔

اس گفتگو کے موقع پر میں دہلی میں تھا اور ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی) کیلی فورنیا میں۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان ۱۴ ہزار میل سے بھی زیادہ کا فاصلہ تھا۔ مگر ٹیلی فون پر دونوں کو ایک دوسرے کی آواز اس طرح صاف سنائی دے رہی تھی جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوں۔ ٹیلی فونی ربط کا یہ نظام شاید اس لیے بنایا گیا ہے کہ انسان اُس دوسرے عظیم تر ربط کے بارے میں سوچ سکے جو بندے اور خدا کے درمیان اعلیٰ ربانی سطح پر قائم ہوتا ہے۔

۱۲ ستمبر کو ان کا باضابطہ دعوت نامہ (۵ ستمبر ۱۹۸۸) بذریعہ ڈاک مل گیا۔ اس میں ٹیلی فونی دعوت نامہ کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کا عمومی موضوع حسب ذیل ہوگا:

The Sirah of Prophet Mohammed and its Message
for Contemporary Men and Women.

میرے پاسپورٹ کے صفحات ختم ہو گئے تھے، مگر اس کی قانونی مدت ابھی باقی تھی۔ صفحات کے اضافہ کی درخواست دی گئی۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی کارروائی تھی۔ مگر تقریباً ایک مہینہ کی دفتری دوڑ دھوپ کے بعد ۱۰ صفحہ کا اضافہ ہو کر پاسپورٹ دوبارہ مل سکا۔ یہ ہندستانی دفتر کا حال تھا۔ دوسری طرف امریکی سفارت خانہ میں ویزا کی درخواست

دی گئی تو انھوں نے درخواست کے اگلے ہی دن ایک سال (۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹) کا ملٹپل ویزا دے دیا۔ یعنی اس ویزا پر میں ایک سال تک امریکہ میں قیام کرسکتا تھا۔ یا ایک سال کے دوران جتنی بار چاہے وہاں جاسکتا تھا۔ جب کہ ہماری درخواست میں صرف دو ہفتہ کا ویزا مانگا گیا تھا ——— یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ ہندستان اور امریکہ کے نظام میں وہ کیا فرق ہے جس نے ایک کو پیچھے اور دوسرے کو آگے کر دیا ہے۔

اس فیاضانہ سلوک کا سبب غالباً یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ریکارڈ کے مطابق پایا کہ اس سے پہلے نومبر ۱۹۸۵ میں میں امریکہ گیا تو میں کانفرنس میں شرکت کے بعد فوراً واپس آگیا۔ وہاں میں نے نہ ان کی انتظامیہ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کیا اور نہ ناجائز طور پر زیادہ ٹھہرنے کی کوشش کی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں صرف وہ شخص مشکلات سے دوچار ہوتا ہے جو وہاں کے نظام سے انحراف کرے۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں ہر حال میں آدمی کو دفتری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خواہ اس نے مقررہ نظام سے ادنیٰ انحراف بھی نہ کیا ہو۔

آخری دنوں میں ایک مسئلہ پیش آیا۔ میرے رفیقِ سفر کو نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنے کے لیے ایک تحریر درکار تھی جس میں بتایا گیا ہو کہ امریکہ کے متعلقہ اسلامی ادارہ نے ان کو بھی میرے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا ہے۔ مگر وقت اتنا کم تھا کہ ڈاک کے ذریعہ سے امریکہ کا خط ہندستان نہیں پہونچ سکتا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے امکانات کو استعمال کرکے جدید انسان نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے دفتر کو بذریعہ ٹیلی فون ضرورت بتائی گئی اور ایک گھنٹہ کے اندر ان کا دستخط شدہ خط دہلی میں موجود تھا۔

یہ تیز رفتار ترسیل اس آلہ کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تصویری مشین (Facsimile machine) کہا جاتا ہے اور جس کا مختصر نام فیکس (Fax) ہے۔ آپ ایک تحریر یا ایک خط تیار کرکے مشین میں ڈالیں، اور ایک سکنڈ کے اندر وہ مطلوبہ مقام پر پہونچ کر ویسا ہی چھپا ہوا نکل آئے گا۔

ابتدائی انسانی دور میں صرف پیدل پیغام رسانی کا طریقہ رائج تھا۔ پھر گھوڑوں کا

استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹیلی گرام، ٹیلی فون اور ٹیلکس کے طریقے دریافت ہوئے۔ اب فیکس کے طریقہ نے سب پر برتری حاصل کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں، مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس کا واقعی شکر ادا کرتے ہوں۔

دہلی کا انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے۔ انتظار گاہ میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی مسافر دروازہ کھلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ ہندستانیوں نے ہندستانی ہوائی اڈوں پر تبصرہ شروع کیا۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے فلاں فلاں ملکوں کے ہوائی اڈے دیکھے ہیں، ان کے مقابلہ میں ہندستانی ہوائی اڈے بالکل پسماندہ نظر آتے ہیں۔ قریب کی کرسی پر ایک جاپانی مسافر بیٹھا ہوا ان کی پرجوش باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں وہ نہایت آہستگی کے ساتھ بولا: دوستو، کسی ملک کا ہوائی اڈہ ویسا ہی ہوتا ہے جس کا وہ تحمل کر سکتا ہو اور جس کا وہ مستحق ہو، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم:

Friends, a country gets the airports it can afford — and deserves. No more, no less.

جاپانی کا یہ تبصرہ سن کر اکثر لوگ چپ ہو گیے۔ تاہم ایک شخص بولا: جناب عالی، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی داداؤں (Political dadas) کی حکومت ہے۔ اور جب تک یہ صورت حال قائم ہے، ہمارے ملک میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

دہلی سے پین ایم (Pan Am) کی فلائٹ نمبر ۶۰۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو صبح چار بجے کا وقت تھا کہ جہاز اپنا پر پھیلائے ہوئے رن وے پر دوڑا، اور پھر اوپر اٹھ کر پرواز کرنے لگا۔ یہ عین وہی انداز تھا جو کسی بڑی چڑیا کا انداز پرواز کے وقت ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز بھی عین اسی اصول کے تحت اڑتا ہے جس طرح کوئی چڑیا اڑتی ہے۔

ہوائی جہاز کیا ہے۔ ہوائی جہاز دراصل چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوائی جہاز کا پہلا کامیاب ماڈل وہ ہے جو نیچر (قدرت) نے تیار کیا۔ اب اگر ہوائی جہاز کی نقل تیار کرنے کے لیے ذہانت درکار ہے تو ہوائی جہاز کی اصل بنانے کا کام کیا ذہانت کے بغیر انجام پا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز، دوسری بے شمار

چیزوں کی طرح، اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ یہاں ایک زندہ ذہانت موجود ہے۔ کائنات کے پیچھے زندہ ذہانت کا اقرار کیے بغیر کائنات کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

ہوائی جہازوں میں سگرٹ پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ مگر ٹوائیلٹ (غسل خانہ) میں سگرٹ پینا سخت منع ہے۔ حسب معمول ٹوائیلٹ کے باہر لکھا ہوا تھا کہ اس کے اندر اسموکنگ نہ کریں۔ اس ممانعت کے نیچے یہ سطر درج تھی:

This lavatory is equipped with a smoke detector

میں نے اس فقرہ کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہا تو اس کا عمدہ لفظی ترجمہ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لمحہ کے لیے خیال ہوا کہ اردو زبان جدید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے۔ مگر یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ انگریزی زبان کا ارتقاء جن حالات میں ہوا، اس کی وجہ سے اس کے اندر مشینی خیالات کو ادا کرنے کی زیادہ بہتر صلاحیت پیدا ہوگئی۔ مگر ایک اور میدان ایسا ہے جہاں اردو (اور عربی) کو مغربی زبانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ ہے روحانی تجربات یا معرفتِ ربانی والے خیالات کو ادا کرنا۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسٹر راجیو گاندھی جہاز چلا رہے تھے۔ اتفاق سے خوشونت سنگھ بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے۔ راجیو گاندھی نے خوشونت سنگھ کو پیش کش کی کہ وہ پائلٹ کے کیبن (Cookpit) میں آئیں اور دیکھیں کہ ہوائی جہاز کس طرح چلایا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز کا ایک عام مسافر صرف ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ اس کا مشاہدہ نہیں کرتا کہ ہوائی جہاز کس طرح اڑایا جاتا ہے۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ میں چاہتا ہوں کہ کائناتی جہاز کے "انجن" کو دیکھوں۔ میں اس عالم غیب کو دیکھوں جس کے تحت یہ عالم شہود چلایا جا رہا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اس کو دیکھے گا۔ مگر اس لذت دیدار کی سعادت انھیں لوگوں کو ملے گی جنھوں نے دنیا میں اپنی "بینائی" کی حفاظت کی ہو۔ جو لوگ دنیا میں اپنی "بینائی" کو کھو دیں انھوں نے گویا اپنے آپ کو اس ربانی مشاہدہ کے لیے نااہل بنالیا۔ وہ دنیا میں خدا کی بات کو دیکھنے سے محروم تھے، آخرت میں وہ خدا کی ذات کو دیکھنے سے محروم رہیں گے۔

دہلی اور فرینکفرٹ کے درمیان سفر کرتے ہوئے جہاز ہلنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک شدید جھٹکے لگتے رہے۔ خالص فنی اعتبار سے اس قسم کے جھٹکے خطرناک نہیں ہوتے۔ مگر ایک عام مسافر جو ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہو اور اس کی سواری ہچکولے کھانے لگے تو اس کا غیر متاثر رہنا سخت مشکل ہے۔ بے اختیار میری زبان سے کلمہ کے الفاظ نکلنے لگے۔

اس وقت خیال آیا کہ آخر وقت میں کلمہ پڑھنے کی اہمیت کیوں ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ مومن پر آخری وقت آئے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ اپنے اعمال نامہ میں کوئی آخری نیکی ریکارڈ کرا سکے۔ اس وقت اس کو سب سے بہتر چیز صرف کلمہ نظر آتا ہے۔ کیوں کہ کلمہ دو سب سے بڑی حقیقت کا اعلان ہے۔ ایک یہ کہ اس دنیا کا معبود صرف ایک اللہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہاں کامل صداقت صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں پر ظاہر کی گئی۔ آخر وقت میں کلمہ پڑھ کر بندہ گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں کوئی عمل نہ کر سکا، اب میں اعتراف کو تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میرے پاس اقرارِ عملی کا سرمایہ نہیں۔ تو اقرار لسانی کو میری طرف سے قبول کر لے۔

ساڑھے آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز فرینکفرٹ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ فرینکفرٹ کو مغربی جرمنی کا تجارتی مرکز (Business capital) کہا جاتا ہے۔ گویا مغربی جرمنی میں اس کی حیثیت وہی ہے جو ہندستان میں بمبئی کی اور امریکہ میں نیویارک کی۔ ۱۹۴۴ کے ہوائی حملہ میں فرینکفرٹ تباہ ہو گیا تھا۔ تاہم اب چند تاریخی عمارتوں کے سوا کہیں اور اس کا نشان موجود نہیں ـــــ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تخریب کے بعد نئی تعمیر کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

فرینکفرٹ میں ایک دکان ہے جو ۳۲۵ سال سے مسلسل جاری ہے اس کا نام میسن (Meissen) ہے۔ یہ کٹلری کی دکان ہے۔ یہاں سے آپ ۷۰ قسم کی قینچیاں اور ایک سو قسم کی چھریاں خرید سکتے ہیں ـــــ تجارت کی کامیابی سب سے زیادہ استقلال پر منحصر ہے۔ مگر یہی صفت موجودہ مسلمانوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

فرینکفرٹ سے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۷۰۶ کے ذریعہ سفر ہوا۔ ساڑھے نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز نیویارک پہونچا۔ نیویارک میں باہر کا موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ تاہم ایرپورٹ کے اندر

کا آدمی اپنے آپ کو ایک جزیرہ میں محسوس کر رہا تھا۔ نیویارک کو عالمی اقتصادی مرکز (World Financial Centre) کہا جاتا ہے۔ یہ جدید مواصلاتی ذرائع کا کرشمہ ہے، اس کے بغیر کسی شہر کو عالمی اقتصادی مرکز کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد تقریباً ۴۰ سال تک امریکہ کو یہ حیثیت حاصل رہی۔ مگر اب امریکہ پر زوال کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا اعتراف حال میں خود رونالڈ ریگن نے کیا۔

پین ایم کی میگزین (دسمبر ۱۹۸۸) میں ایک مضمون سفر کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سفر میں اگرچہ بہت سے فائدے ہیں، لیکن سفر ایک تھکا دینے والا عمل (Tiring task) ہے۔ کم از کم یہ بات میرے لیے صد فی صد سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ اس سفر کے لیے جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میری زبان سے نکلا: مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مذبح کی طرف جا رہا ہوں۔ سفر میں خواہ بظاہر کتنی ہی چمک دمک ہو، مگر میرے لیے وہ ہلاکت خیز حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہر بار یہ سوچتا ہوں کہ اب کبھی کسی سفر میں نہ جاؤں گا۔ مگر مشن کا تقاضا مجبور کرتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔

انسان کا ذہن قدرت کا ایک خاموش کارخانہ ہے۔ وہ ہر آن اپنی "پیداوار" دیتا رہتا ہے۔ البتہ عام کارخانوں کی طرح، ذہن کا معاملہ بھی یہ ہے کہ جیسا "خام مال" اس کے اندر ڈالا جائے اسی کے مطابق وہ اپنی پیداوار دے گا۔ مثلاً ایک شخص حسد، بغض، گھمنڈ اور ناجائز نفع اندوزی جیسی چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے تو اس کے ذہن سے جو چیزیں بن کر نکلیں گی، وہ انھیں برائیوں کا مرکب ہوں گی۔ اس کے برعکس جو شخص صالح چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے اس کا ذہن صالح پیداوار کا کارخانہ بن جائے گا۔

میرے اندر خدا کے فضل سے توحید، آخرت اور تعمیر پسندی کا مزاج ہے۔ اس لیے میرے ذہن سے جو فکری پیداوار برآمد ہوتی ہے وہ ہمیشہ انھیں چیزوں کا مرکب ہوتی ہے۔ نیویارک سے لاس اینجلس جاتے ہوئے راستہ میں بن جانسن کا واقعہ ذہن میں آیا، اس نے کہا تھا کہ لوگوں نے مجھ سے میرا میڈل چھینا ہے نہ کہ میری رفتار (الرسالہ فروری ۱۹۸۹، صفحہ ۵)

میرے ذہن میں آیا کہ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگا کہ: لوگوں نے مجھ

سے اپنی دی ہوئی چیز چھینی ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی چیز۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہمیشہ کم ہوتی ہے اور خدا کی دی ہوئی چیز ہمیشہ زیادہ۔ ہر آدمی جب بھی کوئی چیز کھوتا ہے تو وہ "کم" کو کھوتا ہے "زیادہ" پھر بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ کم کو بھول کر زیادہ پر اپنی ساری توجہ لگا دے۔

ایک اور موقع پر ایک تجربہ گذرا۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آ گیے: آج کا انسان تمنا کے درجہ میں بھی جنت کا طالب نہیں، عمل کے درجہ میں اس کا طالب ہونا تو درکنار۔ ایسی حالت میں لوگوں پر جنت کے دروازے کھلیں تو کیسے کھلیں۔

ہندستان سے امریکہ جانے کے لیے پان امریکن کی دو روٹ ہیں۔ ایک لندن کے راستہ سے۔ دوسرا، فرینکفرٹ کے راستہ سے۔ پچھلی بار نومبر ۱۹۸۵ میں جب میں امریکہ گیا تھا تو لندن کے راستہ سے گیا تھا۔ امریکہ کے لیے میرا موجودہ سفر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہوا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس بار جو ٹکٹ بھیجا وہ فرینکفرٹ کے راستہ سے تھا۔ جس دن میں نے فرینکفرٹ سے نیویارک کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۶۷ سے سفر کیا۔ عین اسی دن پین ایم کا دوسرا جہاز فلائٹ نمبر ۱۰۳ لندن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اگر میری روٹ لندن

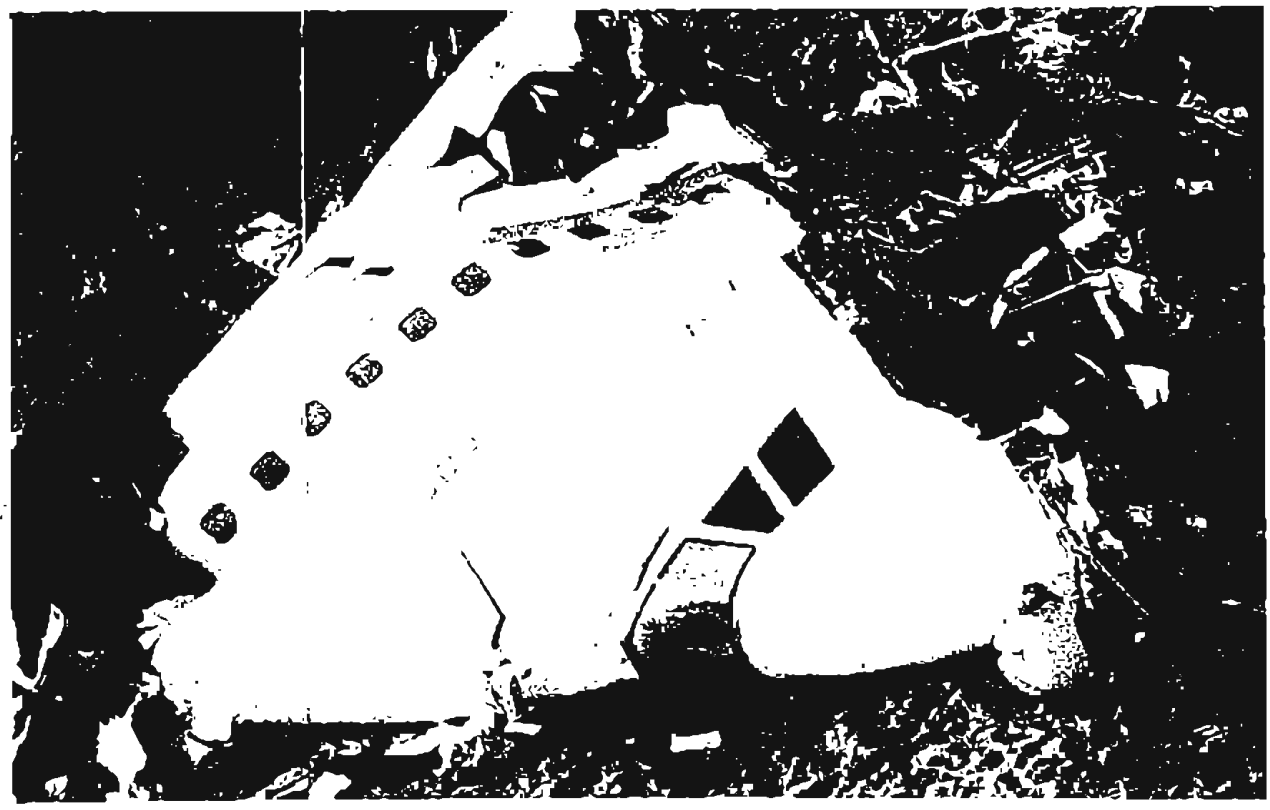

کے راستہ سے ہوتی تو میں عین اسی جہاز میں ہوتا۔

لندن سے نیویارک جانے والے اس جہاز (فلائٹ ۱۰۳) کے ساتھ عجیب حادثہ پیش آیا۔ لندن سے روانہ ہوکر وہ فضا میں بلند ہوا اور ۳۱ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہونچ کر ۸۸۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگا۔ جب وہ اسکاٹ لینڈ میں داخل ہوا تو اچانک اس میں دھماکہ ہوا۔ وہ وہاں کے ایک گاؤں لاکربی (Lockerbie) کے اوپر گر پڑا۔ جہاز مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ اس کے اوپر اس وقت ۲۵۸ مسافر تھے جو سب کے سب فوراً ہی ہلاک ہوگیے۔

امریکہ کی سرزمین پر اترنے کے بعد مجھے جو پہلی خبر ملی وہ یہی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری روٹ کو بدل دیا۔ اگر میرا سفر لندن کے راستہ سے ہوتا تو الرسالہ کے قارئین کو "سفرنامہ" کے بجائے شاید میری موت کی خبر پڑھنے کو ملتی۔

امریکہ کی سرزمین پر پہلی بار میں اپریل ۱۹۸۳ میں آیا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں چھپ چکی ہے۔ اس وقت میں ٹرانزٹ پیسنجر کے طور پر نیویارک ایرپورٹ پر اترا تھا۔ اس موقع پر ایک عجیب ناقابل فہم واقعہ پیش آیا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑا ہوگیا۔ میری باری آئی تو کلرک نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگانے کے بجائے اس کو اپنے پاس رکھ کر مجھے ایک طرف کھڑا کر دیا۔

میں انتظار میں کھڑا ہوگیا یہاں تک کہ تمام مسافر ایک کے بعد ایک چلے گیے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام سپاہی آیا۔ کلرک نے فوراً میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا جیسے کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ اب میں اس سپاہی کی تحویل میں تھا، اور میرا پاسپورٹ اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ مجھ کو لے کر لاؤنج میں کھڑا ہوگیا۔ اب دوبارہ ایک اور شخص کے انتظار کا مرحلہ شروع ہوا۔ کافی دیر کے بعد ایک سفید فام پولیس افسر آیا۔ سیاہ فام سپاہی نے اب میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

سفید فام پولس افسر نے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلا۔ یہاں تک کہ ہم لوگ ایرپورٹ کے باہر پہونچ گیے۔ یہاں پولس کی ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کار پر بیٹھ گیے۔ کار روانہ ہوئی اور مختلف سڑکوں سے ہوتی بالآخر ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے

رکی۔ پولس افسر مجھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ یہ اس کا دفتر تھا۔ یہاں اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔ اور مشین پر میرے پاسپورٹ کے ہر صفحہ کا فوٹو لینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے پولس افسر سے کہا :

Am I under arrest?

اس نے مسکرا کر کہا کہ نہیں۔ اب تک ہم دونوں خاموش تھے۔ اب باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔ اس نے اپنا نام مسٹر لوئی (My Louis) بتایا۔ اس پولس افسر کی کار پر بیٹھے بیٹھے میں نے پہلی بار نیویارک شہر کی ایک جھلک دیکھی۔ تاہم کسی نامعلوم ہدایت کی بنا پر اس نے میرا پاسپورٹ مجھے نہیں دیا۔ وہ مجھ کو لے کر دوبارہ ایرپورٹ آیا اور خود ہی ایر انڈیا کی پہلی فلائٹ سے میری سیٹ کنفرم کرائی اور مجھ کو ہوائی جہاز کے اندر داخل کر کے بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات آپ کو پائیلٹ کے ذریعہ مل جائیں گے۔ چنانچہ دورانِ پرواز مجھے ایک لفافہ دیا گیا جس میں پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔

امریکہ کے لیے میرا دوسرا سفر نومبر ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی مفصل روداد الرسالہ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۶ میں شائع ہو چکی ہے۔ امریکہ کا تیسرا سفر موجودہ سفر تھا جو دسمبر ۱۹۸۸ میں ہوا۔

ہوائی سفر کے اعتبار سے ہماری آخری منزل لاس اینجلیز تھی۔ نیویارک سے لاس اینجلیز تک کا فاصلہ ساڑھے پانچ گھنٹہ میں طے ہوا۔ ایرپورٹ سے جائے قیام (انا ہائم) تک ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کا ساتھ رہا۔ راستہ کی گفتگو میں انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بالکل صحیح طور پر معلوم نہیں۔ عام اندازہ کے مطابق ۸ ملین سے ۱۰ ملین تک مسلمان امریکہ میں آباد ہیں۔ ان مسلمانوں میں عام طور پر دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ایسے ملکوں سے آئے ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ دوسرے، وہ لوگ جو ایسے ملکوں میں تھے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور اب وہ وہاں سے آکر امریکہ میں آباد ہوئے ہیں۔

اکثریتی ملکوں کے مسلمانوں میں دینداری نسبتاً بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے ملکوں میں دینی کام (مثلاً مسجد، مدرسہ وغیرہ) سب حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نفسیاتی

طور پر یہ سمجھنے لگے کہ یہ سب حکومت کے کرنے کے کام ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں انھوں نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اقلیتی ملکوں کے لوگ اپنے ملک میں خود ہی یہ سب کام کر رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ امریکہ (یا دوسرے مغربی ملکوں) میں آئے تو اپنی سابقہ نفسیات کے تحت انھوں نے اس کو خود اپنی ذمہ داری سمجھا کہ وہ اپنے دین کا تحفظ کریں اور مسجد اور مدرسے اور دینی ادارے قائم کریں۔ اس وقت امریکہ میں کثرت سے مدرسے اور اسلامی مراکز قائم ہیں۔ اور یہ زیادہ تر اقلیتی ملکوں کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صدیقی نے بتایا کہ تاہم یہاں کا تہذیبی دباؤ بہت سخت ہے۔ بمشکل دس فی صد مسلمان ایسے ہوں گے جو اپنے دین کے لیے واقعۃً فکرمند ہوں۔ ڈاکٹر صدیقی کی گفتگو ایک یہودی سے ہوئی۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ مغربی ملکوں میں بھی ہم اسلامی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں (we can survive) یہودی نے ان کی بات کو سنا اور پھر بولا کہ تیسری نسل کے بعد آکر مجھے بتانا :

Come and tell me after third generation

جس ادارہ کی دعوت پر میرا یہ سفر ہوا، اس کے دفاتر گارڈن گروو (Garden Grove) میں واقع ہیں۔ تاہم سیرت کانفرنس کا اہتمام قریب کے شہر انا ہائم (Anaheim) میں کیا گیا تھا۔ یہ امریکہ کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں میرا قیام ہلٹن ہوٹل (Hilton and Towers) کے کمرہ نمبر ۱۴۸-۵ میں تھا۔ مذکورہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کی کارروائیاں اسی ہوٹل کے ایک بڑے ہال میں انجام پائیں۔

انا ہائم، کیلی فورنیا میں واقع ہے۔ کیلی فورنیا کے بعض حصے نہایت گرم ہیں۔ مشہور وادی موت (Death Valley) کا تعلق اسی علاقہ سے ہے جو تقریباً ۲۲۵ کیلومیٹر لمبی ہے۔ پروفیسر ارونگ (T.V. Irving) کی تحقیق ہے کہ کیلی فورنیا کا لفظ اسپین سے آیا ہے۔ عرب جب اسپین آئے تو وہاں کے کسی گرم مقام کو انھوں نے قلعۃ القُرن (تنور کا قلعہ) کہا۔ یہ لفظ اسپینی لہجہ میں بگڑ کر کیلی فورنیا ہو گیا۔ اس کے بعد جب اسپین کے لوگ امریکہ آئے اور چلتے ہوئے اس مقام پر پہونچے تو یہ مقام انھیں بہت گرم محسوس ہوا۔ چنانچہ اس کا نام

انھوں نے کیلی فورنیا رکھ دیا۔ گویا کیلی فورنیا ایک عربی لفظ قلعۃ الفرن کی اسپینی صورت ہے۔

ہندستان ایک زیر ترقی ملک ہے۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں ہر چیز کا معیار ہندستان سے ممتاز طور پر مختلف ہے۔ مثلاً ہندستان کا ایک آدمی اپنے ٹی وی سٹ کو چلانے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور اس کا بٹن دبا کر اس کو آن کرتا ہے۔ مگر یہاں آپ کو ٹی وی سیٹ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ فاصلہ پر لیٹے یا بیٹھے ہوئے دیا سلائی کے برابر ایک آلہ کا بٹن دبائیں گے اور آپ کا ٹی وی فوراً چلنے لگے گا۔ ریموٹ کنٹرول کا یہ طریقہ اب امریکہ میں بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔

ہوٹل کے کمرہ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہمیں چابی استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے پاس تاش کے پتہ کی مانند ایک چھوٹا سا سوراخ دار کارڈ تھا۔ اس کو ایک خانہ میں ڈالا جاتا تو وہاں ہری بتی جل جاتی۔ اس کے بعد ایک ہینڈل دبانے سے دروازہ اپنے آپ کھل جاتا تھا۔ یہ کمپوٹر کا کرشمہ تھا۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ہوٹل کے کمرہ کی پشت پر دیواری شیشہ کے باہر میں نے دیکھا تو کمرہ سے ملا ہوا وسیع پارک نظر آرہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ میں تو ہوٹل کی پانچویں منزل پر ہوں، پھر یہاں پارک کیسا۔ مگر یہ چھت کا پارک تھا۔ ہوٹل کے درمیان میں وسیع چھت پر درخت اور پھول اگا کر یہ پارک قائم کیا گیا تھا۔ تاہم اس کی زمین مصنوعی تھی۔ بظاہر زمین پر گھاس کا ہرا لان دکھائی دیتا تھا۔ مگر وہ درحقیقت کیمیائی قالین تھا جو کٹی ہوئی گھاس کی مانند بنا کر زمین پر بچھا دیا گیا تھا۔

ہلٹن ہوٹل کے جس وسیع ہال میں سیرت کانفرنس ہو رہی تھی، ایک بار مجھے اس کے ٹوائیلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے اندر میں نے دیکھا کہ ایک ٹونٹی دار لوٹا (Watering can) رکھا ہوا ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا یہ امریکی لوٹا اس ہندستانی لوٹے سے بالکل مختلف تھا جس کے متعلق یہ استہزائی فقرہ مشہور ہے: "کیا آپ کے شامل بندھنا بھی ہے"۔ یہ اتنا خوبصورت اور اتنا موزوں بنا ہوا تھا کہ وہ آرٹ کا ایک نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اگر اتنا خوبصورت لوٹا بنایا ہوتا تو ناممکن تھا کہ کسی جواہر لال نہرو

کو یہ جرأت ہو کہ وہ ٹونٹی دار لوٹے کو مسلم تہذیب کا نشان بتا کر اس کا مذاق اڑائے۔ اس کے بعد لوٹے کا مذاق اڑانا خود اپنی بدذوقی کا اشتہار دینے کے ہم معنی بن جاتا، اور کون ہے جو اپنی بدذوقی کا اشتہار دینا پسند کرے۔

کانفرنس کے دوران عربوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ ۲۴ دسمبر کو فجر کی نماز کے لیے مقررہ ہال میں پہونچا تو وہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ دکتور جمال بدوی موجود تھے۔ وہ مصری ہیں اور آج کل کناڈا میں رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے اصرار کیا۔ میں نے یہ کہہ کر ان کو آگے بڑھا دیا: الائمۃ من العرب، وانا احبّ ان اسمع قرأۃ العرب۔

فنی قاریوں کی قرأت مجھے پسند نہیں۔ مگر عربوں کی سادہ قرأت مجھے بے حد پسند ہے۔ ایک عرب عالم جب قرآن کی قرأت کرتا ہے تو اس کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ صوتی لہروں پر میرا رشتہ ماضی سے قائم ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر ایک ارتعاش (Thrill) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام بھی اسی طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے۔

یہ اسلام کی ایک نادر خصوصیت ہے جو آج کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ دوسرے مذاہب کی کتابیں جن زبانوں میں تھیں وہ آج مردہ زبانیں بن چکی ہیں۔ یہ زبانیں جس لہجہ میں اپنے ابتدائی زمانے میں بولی جاتی تھیں، ان کا تسلسل بعد کی تاریخ میں قائم نہ رہ سکا۔ اس لیے آج یہ جاننا ناممکن ہے کہ قدیم مذاہب کی مقدس کتابوں کو ان کے ابتدائی حاملین کس طرح پڑھتے تھے۔ مگر قرآن کی زبان پوری طرح ایک زندہ زبان ہے۔ اس کا لہجہ تواتر کے ساتھ تاریخ میں سفر کرتا ہوا ہم تک پہونچ رہا ہے۔ آج کا ایک فصیح عرب عالم جب قرآن کو پڑھتا ہے تو وہ عین وہی لہجہ ہوتا ہے جس میں اصحاب رسول قرآن کو پڑھتے تھے۔ اس طرح ہر فصیح عرب عالم گویا صحابہ کرام کی قرأتِ قرآن کا زندہ ٹیپ ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے جو "قرآنِ محفوظ" کی صورت میں انسانیت کے حصہ میں آیا ہے۔

قومی آواز (۱۳ جنوری ۱۹۸۹) میں ایک عالم کی تقریر نقل ہوئی ہے۔ موصوف نے ایک عربی مدرسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کی زبان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس کی وجہ سے ڈیڑھ ہزار سال سے یہ کلام اور زبان آج تک ایک حرف کی تبدیلی کے

بغیر محفوظ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں تغیرات رونما ہوئے اور ان کی اصلی حالت زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی۔ لیکن عربی زبان انقلاباتِ زمانہ کے باوجود اپنی اصل حالت پر برقرار ہے۔ کیوں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے اور اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ مسلمان بجا طور پر اس پر فخر کر سکتے ہیں (صفحہ ۶)

قرآن کا اور عربی زبان کا محفوظ ہونا اہل اسلام کے لیے فخر کی بات نہیں بلکہ شکر کی بات ہے۔ کوئی شخص کہے کہ سورج کروروں سال سے برابر روشن ہے اور اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے تو یہ ایک لغو بات ہوگی۔ کیوں کہ سورج کو دیکھ کر ہمارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فخر کا جذبہ۔ اسی طرح قرآن اور عربی کا محفوظ ہونا بھی شکر کا موضوع ہے نہ کہ فخر کا موضوع۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل غلطی یہی ہے کہ انھوں نے قرآن اور اسلام کو اپنا قومی فخر بنا لیا ہے۔ یہی وہ برائی ہے جس میں اس سے پہلے یہود مبتلا ہوئے، اور اب مسلمان بہت بڑے پیمانہ پر اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کے پروگرام میں شیخ جاد الحق (شیخ الازہر، قاہرہ) ڈاکٹر عبد المحسن الترکی (ریاض) اور ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف (مکہ) کا نام بھی تھا۔ وہ لوگ اس کے اجلاس کو خطاب کرنے والے تھے مگر آخر وقت میں کچھ اسباب پیش آنے کی وجہ سے وہ شرکت نہ کر سکے۔ ان لوگوں کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس میں ایک عرب شیخ نے بہت دلچسپ تقریر کی۔ انھوں نے عربی میں خطاب کرتے ہوئے کہا: هل قرأتم في القرآن: ادع الى سبيل ربك بالسيف او بالارهاب (کیا آپ نے قرآن میں پڑھا ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف تلوار اور دہشت گردی کے ذریعہ بلاؤ) اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ (النحل ۱۲۵) اس کے بعد انھوں نے بہت اچھے انداز میں اس کی تفصیل کی کہ دعوت دل کو جیتنے کا نام ہے نہ کہ جسم کو قتل کرنے کا۔

میں نے کہا کہ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ دوسرے لوگ اگر "سیف" کو استعمال کریں تب بھی ہمیں حکمت اور موعظت حسنہ ہی کے طریقہ پر قائم رہنا ہوگا۔ اس کے

بغیر حکیمانہ دعوت کا عمل جاری رہنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی (ملک عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ) نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی منفی تصویر (Negative image) بن گئی ہے۔ اس صورت حال کو بدلنا اور لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی مثبت تصویر (Positive image) بنانا وقت کا سب سے بڑا کام ہے۔ یہ عین وہی بات ہے جس کی الرسالہ مشن کے ذریعہ کوشش کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی ہمارے اس مشن سے پوری طرح واقف ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے، مگر وہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں یہ دوسری بات شامل نہ کی جائے کہ تصویر کو بدلنے کا یہ کام خود مسلمانوں کو کرنا ہوگا۔ اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ مسلمان دوسروں کی ایذا رسانی پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ کو شام کے اجلاس میں میں نے اپنا مقالہ (انگریزی) پڑھ کر سنایا۔ سننے کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کی کاپی حاصل کرنا چاہا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے بتایا گیا کہ یہ مقالہ (دوسرے مقالوں کے ساتھ) کتابی مجموعہ میں شائع کیا جائے گا۔ نیز اس کا مکمل ویڈیو ٹیپ بھی کانفرنس کے منتظمین کے پاس موجود ہے۔ مقالہ کا عنوان یہ تھا:

Dawah Activism: The Prophetic Method

۲۴ دسمبر کی شام کو "ورک شاپ" تھی۔ اس میں کافی لوگ شریک ہوئے۔ اس نشست کے ماڈریٹر ڈاکٹر عبدالرحیم الطالب (سوڈانی) تھے۔ ایک اعتبار سے یہ "سوال و جواب" کی مجلس تھی۔ سب کے سب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پوری گفتگو نہایت سنجیدہ علمی انداز میں ہوئی۔

ابتداءً میں نے دعوت کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی کچھ مزید وضاحت کی۔ اس کے بعد تحریری انداز میں سوالات آنا شروع ہوئے۔ تقریباً دو درجن سوال آئے۔ میں نے مختصر اور مثبت انداز میں سوالات کا جواب دیا۔ یہ سوالات کس قسم کے تھے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے تین سوالات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1. Please tell us which are the books in English that can enlighten the non-Muslims who are interested in accepting Islam.

2. We are having difficulty in doing Dawah work because of bad and wrong practices of Muslims. The religion of Islam teaches one thing and the Muslims do just against it. What is your answer to this problem.

3. Could you explain how does one manage to awaken his or her spiritual consciousness.

۲۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس ہال میں ایک اثر انگیز واقعہ پیش آیا۔ اسی روز میں نے اپنا ۴۵ منٹ کا مقالہ پڑھا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنا مقالہ ختم کیا۔ سامنے کی نشستوں پر ایک امریکی نوجوان کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس نوجوان کو اسٹیج پر لایا گیا اور مائک کے پاس کھڑا کر کے اس سے کلمہ پڑھایا گیا۔ اس کے بعد انگریزی میں کلمۂ شہادت کی تشریح بتائی گئی۔

بعد کو اس نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنا نام میریو سرانو (Mario Serrano) بتایا۔ اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس نے بطور خود کچھ اسلام کا مطالعہ کیا تھا، مگر اسلام قبول کرنے کی بابت آخری فیصلہ اس نے کانفرنس میں میرا مقالہ سننے کے بعد کیا۔ اسی طرح امریکہ میں اور پوری دنیا میں ہر روز کچھ نہ کچھ افراد اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اسلام کی اپنی طاقت کے ذریعہ ہو رہا ہے، مسلمانوں کے کسی باقاعدہ تبلیغی عمل کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

۲۴ دسمبر کی شام کو آخری پروگرام تھا۔ اس موقع پر امریکن مسلم کمیونٹی کے قائد امام وہلیس (وارث) محمد نے خطاب کیا۔ وہ باقاعدہ باڈی گارڈ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ وہ شکاگو سے خاص اسی شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا مقصد مکمل لبریشن ہے۔ یعنی انسان کو ہر عملی یا فکری بندھن سے آزاد کر کے ایک خدا کا عابد بنانا۔

آخری تقریر سعودی عرب کے پرنس محمد الفیصل کی تھی۔ وہ سعودی ایمبیسی (واشنگٹن) میں اسلامک افیرس شعبہ کے چیرمین ہیں۔ مسلم ملکوں میں غالباً سعودی سفارت خانہ پہلا سفارت خانہ ہے جس نے اس قسم کا اسلامی شعبہ بڑے پیمانہ پر قائم کیا ہے۔ پرنس محمد الفیصل نے نہایت

سادہ اور سنجیدہ انداز میں انگریزی میں تقریر کی جس میں لقد جاءکم رسول من انفسکم (التوبہ ۱۲۸) کی تشریح بیان کی۔ انھوں نے اپنی تقریر اس جملہ پر ختم کی کہ یہاں آنے سے میرا مقصد آپ کے ساتھ شریک ہونا تھا نہ کہ آپ سے کچھ کہنا:

I came here to share something with you, rather than to say something to you.

کانفرنس ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو تھی۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ یہاں مزید قیام کیا جائے اور مختلف مقامات (نیو یارک، شکاگو، سان فرانسسکو وغیرہ) میں پروگرام رکھا جائے اور وہاں خطابات کیے جائیں۔ اگر میں ان لوگوں کی تجویز مان لیتا تو مجھے کئی مہینے تک یہاں ٹھہرنا پڑتا۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے کانفرنس کے بعد میں صرف چند دن ٹھہر سکا اور بعض اجتماعات کو خطاب کیا۔

۲۳ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ یہ مسجد پہلے چرچ تھی۔ مسیحی حضرات نے اس کو فروخت کر دیا۔ چرچ کی یہ عمارت اب مسجد کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد میں قرآن کا مختصر درس دیا۔ ۲۵ دسمبر کو نماز ظہر کے بعد دوبارہ اس مسجد میں درس حدیث کا پروگرام تھا۔

جمعہ کے دن جب میں مسجد میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نمازی لوگ اس کے اندر متفرق طور پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جب پہلی اذان ہوئی تو اس کے فوراً بعد تمام لوگ مل مل کر صف کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ جماعت سے پہلے کی سنتیں انھوں نے صف بندی کر کے پڑھیں۔ سنتوں سے فارغ ہو کر وہ صف بہ صف بیٹھ گئے۔ خطبہ کے بعد جب جماعت کی نماز شروع ہوئی تو ان کے اٹھتے ہی صفیں قائم ہو گئیں، "آگے آجائیے، آگے آجائیے" کی پکار بلند کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہی طریقہ ہندستانی مسجدوں میں بھی رائج ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔

پروفیسر ایوانے یازبیک حداد کے حوالہ سے معارف (جنوری ۱۹۸۹) میں ایک رپورٹ (امریکہ میں مسلمان) شائع ہوئی ہے۔ اس میں درج ہے کہ:

"امریکہ میں مسلمان عورتیں جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرتی ہیں۔ مگر مرد اپنی ملازمت اور کاروباری مشغولیتوں کی وجہ سے جمعہ کی نماز کے لیے

مسجدوں میں نہیں جاسکتے۔ چنانچہ وہ اتوار کو اجتماعی طور پر ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں " صفحہ ۶۰

امریکہ کے مسلمان مردوں کے بارہ میں اس رپورٹ میں جنرلائزیشن سے کام لیا گیا ہے۔ امریکہ کے مسلمان مرد تین قسموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا۔ ایک گروہ اتوار کے دن ظہر کی باجماعت نماز کو جمعہ کے بدل کے طور پر ادا کرتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو حسب قاعدہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے، ۲۳ دسمبر کو میں خود جمعہ کی ایک جماعت میں شریک ہوا۔

جناب صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ۲۵ دسمبر کو عورتوں اور مردوں کی ایک تعداد جمع ہوئی۔ یہ زیادہ تر تاجر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اس موقع پر آیات اور احادیث کی روشنی میں مفصل خطاب ہوا۔ ۲۷ دسمبر کو نماز عشار کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں تیسرا خطاب ہوا۔ اس کا موضوع حقیقتِ دین تھا۔ پھر ۲۸ دسمبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر دوبارہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے اسلام میں آخرت کا تصور اور اس کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ ان سب تقریروں کا ٹیپ وہاں کے لوگوں کے پاس موجود ہے۔

۲۹ دسمبر کے اجتماع میں ایک انجینیر، صفی الرحمٰن قریشی (پیدائش ۱۹۵۱) بھی موجود تھے۔ میں نے دیکھا پورے مجمع میں وہ سب سے کم بولنے والے ہیں۔ اجتماع کے دوران وہ مکمل طور پر خاموش رہے۔ بعد کو ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث سنائی جس میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص چپ رہا، اس نے نجات پائی (من سکت نجا) میں نے کہا کہ آپ اس حدیث کی تشریح کن الفاظ میں کریں گے۔ انھوں نے کہا: "جب میں بول رہا ہوں تو میں سیکھ نہیں رہا ہوں۔" ان کی یہ مختصر تشریح مجھے بہت پسند آئی۔

ایک مجلس میں دعوتی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہفت روزہ الدعوۃ (ریاض) کے شمارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا کہ کیا ہم مغرب کی مسلم نسلوں کو ضائع ہونے کے لیے چھوڑ دیں:

اجیالنا المسلمة فی الغرب هل نترکها نهباً للضیاع

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت مغربی دنیا میں جو مسلمان آباد ہیں، ان کی تعداد دس ملین

سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ گویا مغرب میں ہمارے سفیر ہیں (ھم سفراءنا فی الغرب)

یہ بلاشبہ صحیح ترین لقب ہے جو مغرب میں مقیم مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں جو مسلمان آباد ہیں، انھیں اگر اپنی اس حیثیت کا شعور ہو جائے تو وہ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

میں نے انھیں ایک حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، مگر وہ مدینہ ہے (اُمرتُ بقریۃ تأکل القری یقولون یثرب وھی المدینۃ) اس حدیث سے اسلام کا طریق کار معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ "مکہ" میں اگر اسلامی دعوت کے لیے حالات نامساعد ہوں تو "مدینہ" کو دعوتی مرکز بنا کر دوسرے علاقوں کو مسخر کرو۔ یہ طریق کار دور اول میں نہایت کامیابی کے ساتھ زیر عمل لایا جا چکا ہے، اور موجودہ زمانہ میں بھی اس کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ امریکہ کو آج اسی قسم کے ایک "قریہ" کا مقام حاصل ہے۔ امریکہ میں وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو قدیم زمانہ میں "یثرب" میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں کے لوگوں میں مختلف اسباب سے دین حق کی پیاس پیدا ہو چکی ہے۔ یہاں دعوت و تبلیغ کے آزادانہ مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں وہ تمام جدید ترین اسباب و وسائل مہیا ہیں جو اشاعت فکر کے کام کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے درکار ہیں۔

مزید یہ کہ امریکہ کو، ایک اعتبار سے، عالمی قیادت کا مقام حاصل ہے۔ اگر امریکہ میں موثر انداز میں دعوتی کام کر کے یہاں کی اکثریت کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے تو وہ دوسری قوموں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث کے الفاظ میں، امریکہ کا "قریہ" دوسرے تمام قریوں کو نگل جائے گا۔

مک کلوسکی (Pete McCloskey) امریکہ کے ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ پندرہ سال تک کانگرس (پارلیمنٹ) کے ممبر رہے ہیں۔ وہ مسلم نواز مشہور ہیں، خاص طور پر فلسطین کے معاملہ میں وہ کھلے طور پر اسرائیل کے مخالف اور عربوں کے حامی ہیں۔ چنانچہ یہاں کے یہودی ان کے سخت مخالف ہیں۔ پچھلے الکشن (کیلی فورنیا) میں یہودیوں نے ان کے خلاف متحدہ ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا۔

اس حلقہ انتخاب میں یہودی ووٹروں کی تعداد ۸۰۰۰ ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں نیویارک میں پانچواں "مسلم ورلڈ ڈے" منایا گیا۔ اس موقع پر روز ویلٹ ہوٹل کے ہال (Grand Ballroom) میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر مک کلوسکی نے کہا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہودی یہاں کی پالیسیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کا یہاں کی پالیسیوں پر کوئی اثر نہیں۔ اس کی وجہ خود مسلمان ہیں نہ کہ امریکی نظام۔ امریکی مسلمان اگر اپنے ووٹوں کا بھرپور استعمال کریں تو وہ یہاں کے نظام کو بدل سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہود نوازی امریکہ کی روایتی پالیسی نہیں۔ موجودہ یہود نواز پالیسی کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کا یہودی گروپ نہایت گہرے طور پر یہاں کے سیاسی عمل میں شریک ہے اور ہر سطح پر اس میں حصہ لیتا ہے۔ امریکہ میں ایک اور طاقتور گروپ ہے جو تعداد میں زیادہ بڑا ہے۔ یہ عرب ہمدردوں (مسلمانوں) کا گروپ ہے۔ مگر وہ ہمارے سیاسی عمل میں شرکت نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کی پامالی کے بارہ میں آپ کے احساسات امریکی نظام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک آپ اس مقصد کے لیے منظم نہ ہو جائیں:

> The reason for the pro-Israeli policy of the United States is because one group of people in this country is deeply involved in political process and participates in it at all levels. The United States has another strong group which is greater in size and that group is Arab sympathisers, (yourselves), which has not participated in our political process. Your feelings about human rights violations will not be translated into American system unless you are not organized.
>
> (*The Minaret*, New York, December 16, 1988)

آپ کو امریکہ میں اور امریکہ کے باہر بے شمار مسلمان ملیں گے جو امریکہ کی مسلم دشمنی پر الفاظ کا دریا بہائیں گے۔ مگر ایسا مسلمان شاید ایک بھی نہ ملے جو سنجیدہ طور پر یہ رائے رکھتا ہو کہ یہ خود اپنی عملی کوتاہی کا مسئلہ ہے نہ کہ امریکہ کی اسلام دشمنی کا۔ امریکہ کو "مسلم دشمنی" کے مقام سے ہٹا کر مسلم نوازی اور اسلام دوستی کے مقام پر لانے کے دو یقینی راستے ہیں۔ ایک دعوتی عمل کا راستہ، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ دوسرا سیاسی عمل کا راستہ، جس کی نشاندہی مسٹر مک کلوسکی نے کی۔

مگر مسلمانوں کے اندر نہ پہلے عمل کے لیے کوئی حقیقی جذبہ ہے اور نہ دوسرے عمل کے لیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خود تو اپنی ساری طاقت اپنا ذاتی مستقبل بنانے میں لگائے رہیں، اور دوسرے لوگ آکر ان کا ملی مستقبل بنا دیں، مگر اس دنیا میں ایسا واقعہ کبھی ظاہر ہونے والا نہیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں امریکہ میں رہنے والے ہندوؤں کا ذکر آیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ وہ لوگ تو رات دن بس ڈالر کمانے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بھی تو یہاں یہی کر رہے ہیں۔ دونوں میں صرف نام کا فرق ہے۔ ہندو کے نزدیک "ڈالر" اگر مذہبی دیوتا ہے تو آپ کے یہاں ڈالر زندگی کا مقصد۔

ڈاکٹر رالف سسن (Dr Ralph R. Sisson) اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ پیدائشی طور پر وہ عیسائی ہیں اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے میں نے ایک ملاقات میں پوچھا کہ امریکہ میں یہودی صرف ۳ فی صد ہیں، اس کے باوجود وہ یہاں چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ہارڈ ورک (سخت محنت) اس کے برعکس یہی سوال کسی مسلمان سے کیجئے تو بلا تامل اس کا جواب ہوگا کانسپریسی (سازش)

موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس نے محبت اور نفرت سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والوں نے امریکی یہودیوں کے بارہ میں بے شمار کتابیں اور مضامین شائع کیے ہیں جن میں جوش و خروش کے ساتھ یہودی سازشوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام تحریریں بالکل سطحی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو اصل حقیقت سے باخبر نہیں کرتیں۔

امریکہ کے موجودہ سفر میں میں نے جو نئی باتیں دریافت کیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کی طاقت کا اصل راز ان کی تنظیم ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے امریکہ میں یہودیوں کی تعداد ۵۸ لاکھ بتائی ہے۔ اس قلت تعداد کے باوجود، انھوں نے اپنے تمام

قابل ووٹ افراد کو ووٹر لسٹ میں درج کرا رکھا ہے۔ ہر الکشن میں ان کے بیشتر افراد ووٹ دیتے ہیں اور ہمیشہ متحدہ طور پر اپنے ووٹوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے تمام ادارے شیرازہ کی طرح باہم مربوط ہیں۔ اپنے قومی مقاصد کے لیے وہ بے دریغ دولت خرچ کرتے ہیں۔ ان میں انفرادی سطح پر اختلافات ہیں، مگر قومی نوعیت کے معاملہ میں وہ ہمیشہ متحد رہتے ہیں۔ وہ اربابِ کار سے مسلسل ربط رکھتے ہیں اور ان کی رائے کو اپنے حق میں متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر کام منظم انداز میں کرتے ہیں نہ کہ اس طرح منفرد انداز میں جس کا ہمارے یہاں عام رواج ہے۔

امریکی مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۸ سے ۱۰ ملین تک ہے۔ جب کہ یہودیوں کی موجودہ تعداد زیادہ سے زیادہ ۶ ملین قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر مسلمان ہر معاملہ میں یہودیوں کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ملک گیر تنظیم نہیں۔ ان کے بے شمار ادارے ہیں، مگر سب کے سب آزاد ادارہ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کے ووٹ یہودیوں سے زیادہ ہیں مگر سیاسی بے شعوری کی بنا پر اب تک وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو استعمال نہ کر سکے۔ امریکی مسلمانوں کا نقطۂ نظر ایک لفظ میں یہ ہے کہ ——— زیادہ سے زیادہ ڈالر کماؤ، اور بقیہ ہر چیز سے غیر متعلق رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کا متحد اور منظم ہونا ان کی اصل طاقت ہے، اور امریکی مسلمانوں کا غیر متحد اور غیر منظم ہونا ان کی اصل کمزوری۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ امریکی زندگی کی الف ب بھی نہیں جانتے۔

آخری اجتماع (۲۴ دسمبر) میں اسلامک سوسائٹی (گارڈن گروو) کے لیے تعاون کی اپیل کی گئی۔ لوگوں نے ڈالر کی صورت میں اپنے عطیات دینے شروع کیے۔ اسٹیج کے پاس ایک بلیک بورڈ رکھا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں مسلسل رقم کی مقدار لکھی جا رہی تھی ——— ایک ہزار ڈالر، ۲۰ ہزار ڈالر، ۳۵ ہزار ڈالر، اس طرح گنتی بڑھتے بڑھتے تقریباً ۹۰ ہزار ڈالر تک پہونچ گئی۔ پورا مجمع بیک وقت بلیک بورڈ پر عطیات کی مقدار دیکھ رہا تھا۔ یہ گویا چندہ کے قدیم طریقہ کو ماڈرنائز کرنا ہے۔ مجھے یہ طریقہ پسند آیا۔

گارڈن گروو (Garden Grove) امریکہ کا ایک شہر ہے جو لاس انجلیز کے قریب

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 June 1989 No 151

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳